شب خون



جنگل میں دھنک

*

جنگل : رنگوں کی ابتری

رنگوں کا تصادم

دھنک : رنگوں کا آہنگ

رنگوں کا وصال

*

یادوں اور دکھوں کے بے ترتیب
جنگلوں میں آسمانی رنگوں سے
سرشار آواز کی گونج !

*

نئی شاعری کا نیا ستارہ :

منیر نیازی

*

زمینِ شعر میں منیر نیازی کے سفر کی روداد

*

جنگل میں دھنک

سرورق اور تصویریں : حنیف رامے

۵/-

بابت اکتوبر ۱۹۶۶ء

سویرا

ایڈیٹر

ریاض احمد چودھری

محمد سلیم الرحمٰن

۳۷

سویرا

ادب ، آرٹ ، کلچر

نیا ادارہ

ترتیب

افسانے

مصوری

اہتمام : مشتاق احمد چودھری

کمپوزیٹر : محمد خلیل — مشین مین : محمد ایوب

ناشر : نذیر احمد چودھری

سویرا آرٹ پریس ، لاہور

سویرا ۳۸

عنقریب شایع ہو رہا ہے

افسانے : کرشن چندر

انور عظیم

بلراج مینرا

عبد الرحمٰن صدیقی

غزلیں : ظہیر کاشمیری

انجم رومانی

شہزاد احمد

ظفر اقبال

جاوید شاہین

انور شعور

طویل نظم : اعجاز احمد

ضخامت : ایک سو صفحات

علامت پسندی اور ادب

ڈاکٹر محمد اجمل

مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ بہت پیچیدہ موضوع ہے اور جب اس کی حدود کے تعین یا تعارف کی کوشش کی جاتی ہے تو آدمی زچ ہو کر رہ جاتا ہے۔ علامت کی جو واحد تعریف ممکن ہے وہ غالباً ایسی تعریف ہے جس میں سارا زور دوسروں کو بہلا پھسلا کر اپنا ہم خیال بنانے پر دیا گیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ میں تھوڑے بہت غیر معقول اعتماد اور معقول تذبذب کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامت سے میری مراد یہ یا وہ ہے اور آپ اس تعریف کو رد نہیں کر سکتے تاوقتیکہ آپ میرے مقدمات کو رد نہ کریں۔ ایسی صورت میں عملی دشواری یہ پیش آتی ہے کہ اگر میں نے اپنے مقدمات کی وضاحت کی کوشش کی تو علامت پسندی کے بارے میں بات نہ کر سکوں گا۔

میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ سرِ آغاز ہی جتلا دیا جائے کہ علامت لفظ ہے اور چیز نہیں ہے؛ یہ الگ بات ہے کہ ہم لفظ سے بھی چیز ہی مراد لیتے ہوں۔ اس لفظ کے معنی کا تعین اس سیاق و سباق سے ہوتا ہے جس میں اسے برتا گیا ہو۔ ایک نقطۂ نظر سے یعنی ایک خاص سیاق و سباق میں سبھی الفاظ علامتیں ہیں اور آدمی علامتی طرزِ عمل کو فعلی طرزِ عمل کا نام دے سکتا ہے۔ پھر علاوہ ازیں دوسرے سیاق و سباق بھی ہیں جن میں لفظ علامت کو بالکل ہی مختلف انداز سے برتا گیا ہے۔ فرائڈی تجزیۂ نفسی میں علامت سے کوئی بھی ایسا معروض مراد لیا جاتا ہے جو مردانہ یا زنانہ جنسی اعضا اور انسانی جسم کے بعض دیگر اعضائے رئیسہ کی نمائندگی کرتا ہو۔ لیکن علامت کی تفاعلی تعریف سے خواب میں نظر آنے والا کوئی ایسا معروض مراد ہوتا ہے جو تجزیۂ نفسی کے دوران کسی تلازمے کو جنم نہیں دیتا اور ماہر تجزیۂ نفسی کو علامت کے معنی سمجھنے کے لیے اساطیر، طلسماتی کہانیوں، لوک ودیا اور زبان کی طرف

رجوع کرنا پڑتا ہے ۔

بہرحال ، فرائڈی تجزیہ نفسی میں بعد میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کی وجہ سے اب علامت کے معنی انسانی جسم کے بعض اہم اعضا تک محدود نہیں رہے بلکہ اس سے چند نفسیاتی پروسس اور خصوصیات مراد لی جاتی ہیں ۔ علامت کو اس نظر سے دیکھنا ایک حد تک بالکل جائز ہے اور ہم سب اس امر کی شہادت دے سکتے ہیں کہ لوک ودیا اور لوک گیتوں میں جنسی چاشنی موجود ہوتی ہے ۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ، یہ مقدمات اور سیاق و سباق کا معاملہ ہے ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان مقدمات اور سیاق و سباق کو معقول سمجھتا ہوں جن کا اعلان ک ۔ گ ۔ ژنگ نے اپنی تجزباتی نفسیات میں کیا ہے ۔

اب میں لفظ علامت کی تعریف کروں گا ۔ غالباً بہتر یہ ہو گا کہ یہاں چند فروق کی وضاحت کر دی جائے ۔ ہمارے مقاصد کے لیے نشان اور علامت میں تمیز کرنا غالباً کافی ہو گا ۔ نشان کسی معلوم شے کی طرف ، لیکن علامت کسی نامعلوم شے کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے مطلب کی وضاحت کی خاطر چند بین بیانات کو بطور اقتباسات پیش کروں ۔ مثلاً کیسیرر (Cassirer) کہتا ہے : " نشان وجود کی مادی دنیا کا حصہ ہے ؛ علامت معنی کی انسانی دنیا کا حصہ ہے ۔" اس سے آگے وہ یہ کہتا ہے : " معاملہ ، بہرحال ، یہ نہیں ہے کہ جن علامتی نشانات سے ہم زبان ، اسطورے اور فن میں دوچار ہوتے ہیں وہ ابتداء صرف " ہوتی " ہیں اور پھر اس " ہونے " سے آگے بڑھ کر ایک خاص معنی کسب کرتی ہیں ، ان کا وجود ان کی معنویت سے ابھرا کرتا ہے ۔"

اور آخر میں علامت پسندی کے متعلق گوئٹے کی رائے بھی پڑھ لیجیے : " علامت پسندی کایا پلٹ کر مظہر کو تصور میں اور تصور کو شبیہہ میں بدل دیتا ہے ؛ شبیہہ میں بدل کر تصور لامحدود طور پر کارگر اور ناقابلِ حصول بن جاتا ہے اور تمام زبانوں کے ذریعے سے اظہار پانے کے باوجود ناقابلِ اظہار رہتا ہے ۔"

یہ امتیازات صرف بجائے خود اہم نہیں ، ان کی اہمیت کی ایک

وجہ یہ ہے کہ یہ نشان اور علامت کے درمیان ایک بنیادی فرق کی نشان دہی کرتے ہیں ۔ نشان کا کام محض نمائندگی کرنا ہے لیکن علامت کسی نامعلوم شے کا بہترین اظہار ہونے کی بنا پر ماہیت کو بدل ڈالتی ہے ۔ لہذا علامت دو سطحوں کے مابین واسطے کا کام کرتی ہے —— یعنی شعور کی اور لاشعور کی سطح ۔ وہ ایک حرکیاتی فنکشن کی مالک ہے ۔ اسی لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ علامت توانائی کی ماہیت بدل دیتی ہے ۔ وہ توانائی کی کایا پلٹ کر اسے ایک زیریں سطح سے بالاتر سطح پر پہنچا دیتی ہے ۔ لیکن علامت کا بظاہر مہمل لیکن دراصل بامعنی پہلو یہ ہے کہ گو اس کا مثیل وجود کی زیریں سطح سے تعلق رکھتا ہے اس کے معنی ہمیشہ بالاتر درجے کے ہوتے ہیں ۔ منڈل کی شکلوں کو لیجیے ۔ منڈل کی بعض شکلوں میں مرد عورت جنسی ہم آغوشی میں یکجا نظر آتے ہیں یا عقاب کی گردن میں سانپ لپٹا ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان شکلوں کا مثیل جنسی معنی کا حامل ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے منڈل کی شکلیں کھینچی تھیں وہ ان سے کوئی جنسی احساس یا تلازمے وابستہ نہ کرتے تھے ۔ ان کے احساسات لامحالہ وحدت کے احساس سے عبارت تھے اور جنسی ہوس اور اجبار سے ایک خاص حد تک آزادی ظاہر کرتے تھے ۔

عقاب — اگرچہ اس کا مثیل پرندہ ہے اور منہا شدہ معنی اعضائے تناسل ہیں — لامحدود کی بے چین چھان بین کی نمائندگی کرتا ہے ۔ جو لوگ ژنگی تجزیہ نفسی سے گزرے ہیں انہوں نے بالعموم اس علامت کو عظیم طاقت اور نفسیاتی توانائی کا حامل محسوس کیا ہے ۔ ان کے تجربے میں یہ بھی آیا کہ اگرچہ یہ بے حد طاقتور علامت ہے لیکن اس کی بدولت جلد ہی اس کی ضد ، یعنی سانپ ، کی احتیاج سر ابھارنے لگتی ہے ۔ عقلی اڑانوں کو زمین کی ضرورت رہتی ہے اور وہ زمینی ہیجانات سے یکجاں ہونے کے لیے مچلنے لگتی ہیں ۔ شاید اقبال پر عقاب کی گرفت بہت زیادہ تھی اور وہ اس کی طاقت کا بھرپور اور اس کی ضد — یعنی سانپ — کا بہت تھوڑا ادراک رکھتے تھے ۔ نطشے نے کہا تھا : مجھے سانپ نے کاٹ کھایا ہے ۔ اقبال ، ایسا لگتا ہے ، اتنی بلندی پر پرواز کرتے ہیں کہ سانپ ان تک پہنچ ہی نہیں پاتا ۔

آئیے ، اب ہم ایک امتیاز اور قائم کر لیں ۔ ہر علامت کو ایک پہلو سے شعوری اور دوسرے پہلو سے لاشعوری کہا جا سکتا ہے ۔ ہر تصور حتیٰ کہ انتہائی فعلی تصور بھی ، اپنے اندر لاشعوری عناصر چھپائے ہوتا ہے ، اور ہر نفسیاتی پروسس ایک مسلسل بہاؤ کی شکل میں لاشعور سے شعور کی طرف اور اس کے برعکس متحرک رہتا ہے ۔ اگر یہ امتیاز جائز ہے تو پھر شاید کسی حد تک اس امر کو نظر انداز کرنا بجا ہے کہ ادیب شعوری طور پر ان علامتوں سے کیا معنی لیتا ہے جو اس نے استعمال کی ہیں ۔ لاشعوری معنی کا پتا صرف اس سیاق و سباق کے مطالعے ہی سے لگایا جا سکتا ہے جس میں ادیب نے انہیں برتا ہو ۔ چنانچہ ، مثال کے طور پر ، جب اقبال عقاب کو استعمال میں لاتے ہیں اور اپنی نظموں اور خطوں دونوں میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ اس لفظ سے ان کی کیا مراد ہے تو اس علامت کی تشریح کے بارے میں آدمی کو اپنا فیصلہ اس وقت تک موقوف رکھنا چاہیے جب تک کہ اس سیاق و سباق کا مطالعہ نہ کر لیا جائے جس میں شاعر نے اسے استعمال کیا ہے ۔ بے شک کسی مصنف کا مطالعہ کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ براہِ راست اس سے رجوع کیا جائے لیکن غالباً کسی علامت کے لاشعوری معنی کو سمجھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مدھم سروں پر دھیان دیا جائے ، دبی دبی آوازوں کو سنا اور بین السطور اچھی طرح جھانک لیا جائے ۔

اب مجھے علامتی واردات کی دو خصوصیتیں بیان کرنے دیجیے ۔ ایک خصوصیت تو ہے لاھوتیت اور دوسری ہے نورانیت ۔ لاھوتی سے میری مراد ، بقول ژنگ ، وہ اثر انگیز لحن ہے جو اسرار کا حامل ہوتا ہے ؛ مطلب یہ ہے کہ یہ خصوصیت عقلی اصطلاحوں اور ناقدانہ فہم کی مدد سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی ۔ نورانی سے میری مراد وہ خصوصیت ہے جو روشنی کے ھالے ، روشنی کے دائرے یا روشنی کے کسی اور انداز کی حامل ہو ؛ یہی اس واردات کی مبین خصوصیت ہے ۔ اب دیکھیے کہ تمام مذھبی واردات لاھوتی بھی ہوتی ہے اور نورانی بھی ۔

مجھے یوں لگتا ہے کہ تمام خالص شعری وارداتیں مذھبی وارداتوں

سے بہت قریب ہوتی ہیں۔ ہر خالص شعری واردات علامتی ہوتی ہے۔ وہ شعوری رویے اور لاشعوری رویے کے مابین واسطے کا کام انجام دیتی ہے۔ شعور ایک سوال پوچھتا ہے اور جواب میں لاشعور کوئی علامت یا علامتوں کا کوئی سلسلہ، جس کا اساطیر اور لوک ودیا میں اظہار ہؤا ہو، فراہم کر دیتا ہے۔ نخستمثالی شکلوں کا حامل لاشعور علامتوں ہی کے ذریعے سے بہترین طور پر اپنا اظہار کر سکتا ہے۔ روح ہی وہ واحد بلاواسطہ واردات ہے جو ہمارے حصے میں آ سکتی ہے اور یہی دنیا کی داخلی حقیقت کی ناگزیر شرط ہے۔ روح جو علامتیں خلق کرتی ہے ان کی جڑیں ہمیشہ لاشعوری نخستمثال میں ہوتی ہیں لیکن ان کی ظاہری شکلیں ان تصورات کے سانچے میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں جو شعوری ذہن نے تحصیل کیے ہوں۔ نخستمثالیں روح کے لاہوتی تعمیری عنصر ہیں اور یہ ایک قسم کی خود مختاری اور نوعی توانائی کی مالک ہوتی ہیں جو انھیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ شعوری ذہن سے اس مافیہ کو اپنی طرف کھینچ سکیں جو خود ان کے لیے سب سے موزوں ثابت ہو۔ ژنگ کہتا ہے: "لاشعور گویا کہ نخستمثالی شکل فراہم کرتا ہے جو بذاتِ خود خالی ہوتی ہے اور اس لیے اسے کسی صورت میں پیش کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لیکن شعوری طرف سے وہ فی الفور ایسے قابلِ نمود مواد سے بھر جاتی ہے جو یا تو اس جیسا یا اس سے مشابہ ہوتا ہے اور یوں قابلِ ادراک ہو جاتی ہے۔"

کہنے کا مطلب یہ ہؤا کہ جونہی نخستمثال کے اجتماعی انسانی اندرون کا، جو اجتماعی لاشعور کے فراہم کردہ خام مواد کی نمائندگی کرتا ہے، شعوری ذہن اور اس کے شکل بخش فنکشن سے رشتہ قائم ہوتا ہے تو نخستمثال "جسم"، "مادہ" یا "لوچ دار شکل" میں ڈھل جاتی ہے۔

جب ان علامتوں پر ایک عرصہ تک شعوری طور پر توجہ دی جائے تو یہ بالعموم ترقی کر کے ایک سلسلہ بن جاتی ہیں۔ تازہ ترین تحقیقات کی رو سے نخستمثالی واردات کا یہ سلسلہ وحدت یا انفرادیت پردازی کی طرف لے جاتا ہے۔

شاعر یا تخلیقی ادیب بھی، میرے خیال میں، علامتیں برتتا

ہے لیکن مجھے اس میں شک ہے کہ اسے ہمیشہ وحدت یا انفرادیت پردازی کی تلاش ہوتی ہے ۔ حقیقت کے بارے میں اس کا رویہ جمالیاتی ہوتا ہے ، مذہبی نہیں ۔ لیکن میں یہ رائے دینے کی جرأت کرتا ہوں کہ جس عظیم ترین رفعت کو چھونے کا شاعری حوصلہ کر سکتی ہے اس تک صرف وہی شاعر پہنچ سکتا ہے جو اخلاقی اور مذہبی واردات سے بہت گہرا سروکار رکھتا ہو ۔ اگر یہ درست ہے تو ہم شاید یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی شاعر یا تخلیقی ادیب کی عظمت کا تخمینہ ، کم از کم بعض پہلوؤں سے ، اس کی شبیہیت کا انفرادیت پردازی کی شبیہیت سے مقابلہ کر کے لگایا جا سکتا ہے ۔

ہم نہ صرف ان علامتوں کا جنھیں کسی شاعر نے برتا ہے بلکہ ان علامتوں کا مطالعہ بھی کر سکتے ہیں جنھیں اس نے استعمال نہ کیا ہو ۔ صرف انھی سوالوں کا مطالعہ نہیں جو اس نے اٹھائے ہیں بلکہ ان سوالوں کا بھی جو اس نے نہیں اٹھائے ۔ یوں ہم تمام نوعِ انسانی سے اور ان خوابوں اور وژنوں سے جو اپنی طویل تاریخ کے عرصے میں اسے نصیب ہوئے شاعر کی قرابت اور وحدت کو دیکھ سکتے ہیں ۔

ترجمہ : محمد سلیم الرحمان

(نوٹ : اس مضمون میں نفسیات کی اصطلاحیں خاصی برتی گئی ہیں ۔ ان کا ترجمہ مشکل تھا ۔ چند ایک الفاظ گھڑنے پڑے ۔ مطالب کی وضاحت کے لیے اہم الفاظ مع ترجمہ یہاں درج کیے جاتے ہیں :

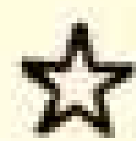
انفرادیت پردازی	Individuation
شبیہہ	Image
شبیہیت	Imagery
علامت	Symbol
— پسندی	Symbolism
لاھوتیت	Numinousity
نخستمثال	Archetype
نشان	Sign
نورانیت	luminosity

مترجم)



۶ - ستمبر ۱۹۶۵ء — عمل : صادقین

ظفر اقبال



جیہڑی مینوں کھچ کے زہر کنارے لیائی سی
ہوٹھاں دی تنہائی سی ، اکھاں دی برپائی سی

ساوی بدلی جئی سی بوہے وچوں لنگھدی
پتا نئیں اوہ آپ سی یا اوہدی بھرجائی سی

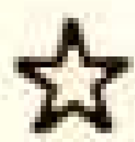
اوہدے دکھ دوا سن ، اوہدے ہتھ شفا سن
اوہنوں کسراں آکھدے ؟ اوسے نال لڑائی سی

میرے مگرے مگر سی : دھپے، چھانویں ، تھاں تھاں
میں بھکھا ساں رج کے ، اوہ میرا قرضائی سی

دل وچ اوہدی شکل دا نقشہ بجھدا کس طراں
میں پتھر دا پندہ ساں ، اوہ ویہناں دی وائی سی

ساواں ورگی سی ظفر ، چھاواں ورگی سی ظفر
جس نوں دھندی دھپ دی گنگی گل سنائی سی

ظفر اقبال



چھپے پردے سن جسم دے ، ستواں نین نقاب دا
اندر چانن ہار سی شعلہ کسے شراب دا

ہریاں ہتھاں وچ سی رونق سنگھنے سمے دی
متھے اُتے رنگ سی شوہ شیشے دی آب دا

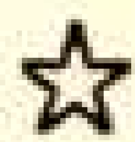
لبڑے ہوئے لفظ سن گھاہ دے اندر گھوکدے
وا وچ اُڈدا پیا سی ورقہ کسے کتاب دا

خاکی چادر خوشی دی جس دے اندر رات دن
نگھرن نقش نویکلے ، اُگھڑے عکس عذاب دا

ٹوٹے ٹبے وہم دے آسرن انھی اکھ وچ
مٹی کسے گویڑ دی ، ریتا کسے حساب دا

دو رتاں دا روپ سی اوہدے مکھ منیر تے
پیلا ہتر سی ظفر ، نالے شہر گلاب دا

انور شعور



اکیلے کیا پسِ دیوار و در گئے ہم تم
سگانِ خفتہ کو ہشیار کر گئے ہم تم

قدم قدم پہ عجب بے حیا نگاہوں کا
حصار سا نظر آیا جدھر گئے ہم تم

گلوں نے خوب پزیرائی کی کہ سہواً بھی
کسی چمن میں نہ بارِ دگر گئے ہم تم

اُمیدِ وصل کے دن کٹ گئے بھٹکنے میں
نہ ہوٹلوں پہ یقیں تھا نہ گھر گئے ہم تم

ہوائے دہر نے سہما دیا تھا کس درجہ
کواڑ بھی اگر کھڑکا تو ڈر گئے ہم تم

فلک کی دھن تھی مگر فرش پر ہمارے پاؤں
جمے نہ تھے کہ خلا میں بکھر گئے ہم تم

زہے یہ ہمتِ پرواز بھی مگر اب تو
نشیب میں کئی زینے اُتر گئے ہم تم

جاوید شاهین



بگولے بہت ھیں مری گھات میں
گھرا ھوں عجب دشتِ حالات میں

کبھی خوں سے رنگیں بھی ھو چشمِ تر
دھنک بھی نظر آئے برسات میں

کسی درد کی آنچ دے کر پرکھ
چمکتی ھے اک شے مری ذات میں

لکیروں کا ھر سلسلہ بے کراں
کھلے پانیوں کا سفر ھات میں

وھی تیری آنکھوں کے حیرت کدے
وھی میں جہانِ طلسمات میں

سیہ گھر کی بیمار ضو سے نکل
ذرا گھوم پھر چاندنی رات میں

بچھا ھے کہیں ذھن میں دام سا
پھڑکتا ھے کوئی خیالات میں

بجا نرمیٔ لفظ شاھیں مگر
لیے پھر کوئی سنگ بھی ھات میں

جاوید شاہین



رشتۂ جسم و جاں کی بقا مانگتے رہو
وہ وقت ہے کہ سب کا بھلا مانگتے رہو

کھل جائیں گرم تنگ مکانوں کے سب کواڑ
موسم عجب ہے ، تیز ہوا مانگتے رہو

جو توڑ دے بدن میں خموشی کے سب حصار
دل سے وہ سخت سنگِ صدا مانگتے رہو

تپتی رہیں رگیں کسی زہرابِ درد سے
ہونٹوں پہ کوئی تیز مزا مانگتے رہو

بہتر ہے فردِ دل میں برابر رہے حساب
اس سے وفا کرو تو صلا مانگتے رہو

توڑو فریبِ سایۂ اشجار بار بار
راہِ طلب سے اپنا پتا مانگتے رہو

ممکن ہے زیرِ ریگِ رواں موجِ آب ہو
تفسیرِ رازِ دشتِ بلا مانگتے رہو

ان ظلمتوں کے بارِ گراں سے جھکے نہ سر
شعلے کی ایک یہ بھی ادا مانگتے رہو

شاہین معاملاتِ جہاں میں لحاظ کیا
اس سے حسابِ خلقِ خدا مانگتے رہو

جاوید شاہیں



آنکھ میں کتنے طلسماتِ جہاں پاؤ گے
خون رنگیں ہے تو سو رنگ یہاں پاؤ گے

ہو فراغت تو ذرا جھاڑو خیالوں کے شجر
شاخساروں پہ بہت برگِ خزاں پاؤ گے

یوں سنبھالے نہ پھرو دل میں شکستہ شیشے
کرچیاں بکھریں تو رگ رگ میں رواں پاؤ گے

موجۂ ریگِ درخشاں کے تعاقب میں رہو
ان سرابوں ہی میں پانی کا نشاں پاؤ گے

رشتۂ تارِ نظر سے ہے اجالوں کا بھرم
آنکھ جھپکی تو کوئی اور سماں پاؤ گے

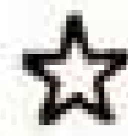
یہ خرابہ ہی سہی ، اس سے نہ باہر نکلو
چھوڑ کر دل کو کہیں پھر نہ اماں پاؤ گے

سانس الجھی ہوئی آتی ہے تو ہے کس کی خطا
آگ اندر ہے تو اندر ہی دھواں پاؤ گے

کس قدر شور ہے لوگوں سے بھری گلیوں میں
غور سے دیکھو ، بہت خالی مکاں پاؤ گے

کشتِ دل ہی سے کوئی چشمہ نکالو شاہیں
خشک سالی میں یہاں پانی کہاں پاؤ گے

جاوید شاہین



خسِ بدن میں برنگِ شرار آئے کوئی
چمک اٹھوں میں ، غمِ آب دار آئے کوئی

مری نظر میں چمکتے ہیں گرم و سردِ جہاں
میں جانچ لوں گا ، زرِ کم عیار آئے کوئی

ہے زخم زخم بدن سنگِ حرفِ تلخ سے آج
کہیں سے نرمیٔ لب کی پھوار آئے کوئی

میں جل گیا دلِ ویراں کی خشک وادی میں
فرازِ درد سے پھر آبشار آئے کوئی

ہے زعمِ شعلہ تو دیکھے ہوائے درد کا زور
چراغ ہے تو سرِ رہگزار آئے کوئی

یہ دشتِ تشنہ لبی چھوڑ کر میں کیوں جاؤں
مرے لیے تو یہیں جوئے بار آئے کوئی

غنیمِ شب کو میں زخموں سے چور کر آیا
سحر کا آخری نیزا بھی مار آئے کوئی

اک اور بھی ہے جہاں اس جہانِ جبر سے دور
مجال ہے تو وہاں شہر یار آئے کوئی

ٹھہر گئے ہیں کہاں میرے ہم سفر شاہیں
کھڑا ہوں دیر سے جنگل کے پار ، آئے کوئی

سلیم شاہد



صبحِ سفر کا راز کسی پر یہاں نہ کھول
طوفان ہے ، پانیوں میں ابھی بادباں نہ کھول

پسماندگاں پہ چھوڑ کہ ڈھونڈیں نقوشِ پا
جو سنگ و خشت ہیں تہہِ آبِ رواں نہ کھول

میں نے سرابِ وہم کے سب راز پا لیے
اب لاکھ مجھ پہ عقدۂ ہفت آسماں نہ کھول

سب کچھ یہاں ہے چشمِ خریدار کی پسند
عذرِ متاعِ درد اگر ہے دکاں نہ کھول

شاخِ شجر پہ شعلۂ خورشید بجھ تو لے
کچھ دیر تیرگی پہ درِ خاکداں نہ کھول

ہر بزم کیوں نمائشِ زخمِ ہنر بنے
ہر بھید اپنے دوستوں کے درمیاں نہ کھول

شاہد حصارِ جہل پہ تیشے سے وار کر
ان پتھروں کے روبرو اپنی زباں نہ کھول

مگر ھارن بجانے کی اجازت نہیں

عباس اطہر

چپ چاپ گزر جاؤ
یہاں ھارن بجانے کی اجازت نہیں
اور میں نے تمنا کا بھرم کھول دیا ھے کہ سمندر کی ھوا
سینے سے ٹکرائے تو پردہ نہ رھے

اس کی مہک سر پہ کفن باندھ کے نکلی ھے
ھر اک راستے ، ھر موڑ پہ آواز لگاتی ھے
مگر کوئی نہیں رکتا ، بسنت آئی ھے
سب بھاگ رھے ھیں ، کوئی آواز نہیں دیتا
کوئی مڑ کے نہیں دیکھتا
پٹرول لہو اور ھوا ، دست و گریباں ھیں
جدھر دیکھو پتنگیں ھی پتنگیں ھیں
زمینوں پر اترنے کے لیے ڈولتی ، پر تولتی ، بل کھاتی ھوئی
صبح کو کٹتی ھیں ، مگر شام کو سڑکوں پر اترتی ھیں
تو وہ کون ھے جو
آنکھوں کے سامنے سے گریزاں ھے
مگر صبح ھی صبح چپکے سے سو سیڑھیاں چڑھ جاتا ھے ، تھکتا ھی نہیں
اور نئی آگ دھکتی ھے -
نئے ، رنگے ھوئے کاغذوں سے حشر چمک اٹھتا ھے
سب عورتیں اور مرد ، جواں لڑکیاں اور لڑکے
نئی ٹیکسیاں اور موٹریں اور رکشے
انھیں لوٹنے نکلے ھیں ، بسنت آئی ھے
آ جاؤ ! یہاں لوٹ مچی ھے

در و دیوار کو حسرت کی نظر دیکھنا ، مت بھولنا
اک دوسرے کو روندتے
اک دوسرے کے خون میں بھیگے ہوئے
سر پیٹتے اور چیختے چلاتے سبھی بھاگ رہے ہیں
کوئی آواز نہیں دیتا
یہاں ماؤں سے اور بہنوں سے اور بیویوں سے
آخری بوسوں کی اجازت ہے
مگر ہارن بجانے کی اجازت نہیں

نظم

بمل کرشن اشک

جب مسز سکھ پال سنگھ کی جرأتوں پر نظم لکھنے کے لیے
میں نے ماضی کو پکارا ،
میرے کمرے میں صدائیں گونج اٹھیں :

" ڈونٹ بادر ، وہ سمجھتے ہیں میں تم سے
ایزرا پاؤنڈ کی نظمیں سن رہی ہوں ۔
وہ بھی کیا بوسہ کہ ہندوستانی بیوی کی طرح خاموش ہو ۔"

" پرس میں کچھ بھی نہیں ہے ۔
میرے چنکیلے بدن کی آرزو کا رنگ مصنوعی نہیں ہے ۔"

" میں مبارکباد کی قائل سہی ، دھوکا نہ کھاؤ ۔
پہلے اس کے نقش ، پھر آئینہ دیکھو ۔
آخرش سکھ پال سنگھ کو میرے منہ پر کیوں مبارکباد دی تھی ! "

حال کے کمرے کی کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا........

" تم سمجھتے ہو کہ جوتے نیم کی شاخوں پہ جھولا جھولتے ہیں ۔
بیل پر کڑوے کریلے کی روپے کے نوٹ لگنے سے رہے ۔
جاؤ ڈھونڈو کس جگہ کھو آئے ہو ۔"

جس طرح ہنس مکھ مجرد دوستوں کے ہونٹ پر ننگا بدن ہو ،
ہند کروں کے لطیفے ہو رہے ہوں
اور کوئی شادی شدہ عورت ، کسی ایک دوست کی بیوی
زباں پر بینگنوں کا بھاؤ لے کر ،
رنگِ محفل میں مخل ہو ۔

کیا مسز سکھ پال سنگھ کی جرأتوں پر نظم لکھنے کے لیے
میں نمبولی کی جگہ جوتے اگاؤں ؟
بیل پر کڑوے کریلے کی روپے کے نوٹ کی گڈی لگاؤں....
روؤ مت
جاؤ بچو ، جاؤ ڈھونڈو ،
جاؤ ڈھونڈو کس جگہ کھو آئے ہو ۔

نظم

بمل کرشن اشک

آدمی سے بڑھ کے کوئی کیا کمینہ ہو سکے گا
یہ وہ شعبہ ہے کہ جس میں آدمی کا کوئی بھی ثانی نہیں ہے
پاؤں سے سر تک وہ بے پایاں خلا ہے
جس کو بھرنے میں ہمالہ بے اثر ہیں۔
نیند، خالی پیٹ کی مانند بھوکوں سے بھری ہے
ان گنت بھوکیں کہ جن کا پیٹ بھرنا
مختصر ہفتے کی قسمت میں نہیں ہے۔

کیا اسی فن کار کی تخلیق ہوں میں
جس نے پھولوں، چاند، تاروں کو بنایا۔
جب کہا میں نے کہ اس کا جسم پھولوں کی طرح ہے،
کس لیے نرگس کا منہ پیلا پڑا؟
جب کہا میں نے کہ وہ مہتاب کا ٹکڑا ہے
تو سورج مکھی نے
کس لیے آنکھیں چرا لیں؟
جب کہا میں نے کہ اس کی بزم اک انجم کدہ ہے
کس لیے تاروں نے منہ پر ابر پہنا؟
میں نے پھولوں، چاند، تاروں کی بہت بے عزتی کی
میں معافی چاہتا ہوں۔

کتنے فن‌کاروں کی ہر تخلیق اک ایسی نہیں ہے۔
شاید اس کا پہلا پہلا شعر ہوں میں
پہلا پہلا شعر پہلا تجربہ —
تجربہ جس کی اشاعت ہو چکی ہے
جس میں گو ترمیم لازم ہے مگر ممکن نہیں ہے۔

درد تنہائی کی پسلی سے نکل کر آیا

عادل منصوری

•

درد تنہائی کی پسلی سے نکل کر آیا
رات کا ہاتھ لگا اور ہوا ٹوٹ گئی
سورجی آگ میں جھلسا گیا سایہ سایہ
روح کی آنکھ کھلی چاند شکستہ پایا
نیلے آکاش کے نیزوں پہ سیاہی چمکی
وقت کے جسم میں لمحوں کی کمانیں ٹوٹیں
پاؤں میں پھانس چبھی آنکھ میں رستہ نکلا
درد تنہائی کی پسلی سے نکل کر آیا

•

خواہش کی دیوار کے پیچھے

خواہش کی دیوار کے پیچھے
زنگ آلودہ پانی
پانی کے اک اک قطرے میں
سورج کی عریانی
عریانی میں نیلے پیلے
رنگوں کے دروازے
دروازوں میں لمحہ لمحہ
لہراتے سے سائے
سایوں کے سینوں کے اندر
پت جھڑ کی ویرانی
خواہش کی دیوار کے پیچھے
زنگ آلودہ پانی

تبوک آواز دے رہا ہے

عادل منصوری

تبوک آواز دے رہا ہے
زمیں سے اب جو چپک رہے گا
منافقوں میں شمار ہو گا
لہو کے سورج کی لال آنکھیں
اداس لمحوں کو سونگھتی ہیں
کھجور پکنے کا وقت بھی ہے
وہ اڑتے پرچم کی شان دیکھو
ہوا میں ہنستا نشان دیکھو
بلندیوں کی طرف بلاتا ہے آج کوئی
سفر کٹھن ہے
سواریاں اور سفر کا سامان ساتھ لے لو
سفر کٹھن ہے
تمہارے اونٹوں کی گردنوں سے
تمام دنیا میں نور پھیلے
تمہارے گھوڑوں کی ہنہناہٹ
تمہاری منزل کی راہ کھولے
یہ دھوپ سائے کے ساتھ ہو گی
ابھی ابھی قافلہ گیا ہے
تبوک آواز دے رہا ہے
میں اپنے گھوڑے کی باگ موڑوں
میں اپنے گھر کی طرف نہ جاؤں

عرضِ ہنر

فاروق حسن

ٹوٹتے گرتے ہوئے لفظوں کو
دیکھ کر کہتا ہوں کس کو سمجھاؤں ؟
کون سا لفظ لکھوں ؟
کوئی ثابت ، کوئی سالم نہ ملا
مٹیاں ٹوٹی ہوئی
ڈیوڑھیاں گرد سے آراستہ ، کمرے ویران
شہ نشینوں پہ دراڑیں ، مضروب
در و دیوار سے تجرید عیاں
ریختہ سیڑھی پہ چڑھنے والا
ایسے اُلجھے کہ لڑھک کر نہ سنبھلنے پائے۔

کون سا لفظ لکھوں ؟
لہر آتی ہے تو ساتھ اپنے کئی سیپیاں
گھونگے ، موتی
آب کی تہہ میں نہاں سارے نوادر لے کر
سعئی لاحاصلِ معنی کے لیے بڑھتا ہوں
ساحل کو ، مگر
لوٹ جاتا ہے سمندر اسی ویرانے کو
جس جگہ لہر بنی ، لہر گئی ۔

کون سا لفظ لکھوں ؟
درد سینے میں اُٹھا
رات سوتے ہوئے تاریک مکاں میں اُٹھ کر
کرسیوں ، میزوں سے ٹکراتا ہوں
کونے میں دھرے واز سے سر پھوڑتا ہوں

اور محسوس کیا کرتا ہوں لذت خوں کی
قطرہ قطرہ جو بھٹکتا ہؤا گر جاتا ہے پیشانی سے

کس کو سمجھاؤں کہ کیا کہتا ہوں ؟
کس لیے لکھتا ہوں وہ لفظ
جو ٹوٹے ہوئے ، بکھرے ہوئے ملتے ہیں
کتب خانوں کے ویرانوں میں

آج تک میں یہ کہاں جان سکا
جو مرا نام ہے وہ نام مرا کیسے ہے ؟
جو مری بات ہے وہ بات ہے کیسے میری ؟
کون سا لفظ ہوں میں
اور کسے حاصل ہوں ؟

خاموشی کی چیخ

ناھید ثانی

صدائیں جو صدیوں کی چرخی پہ لپٹی ہوئی
ڈور کی طرح کھلتی، سمٹتی، مچلتی ہوئی
سوچ کے بحرِ زخار میں اٹھ رہی ہیں۔

میں نہیں جانتی میں سمندر ہوں یا آدمی یا وہ تحت الثریٰ
جس کی حد بندیاں اور کنارے پرانے زمانوں کی تاریخ میں گمشدہ ہیں۔
مگر
صداؤں کی لہریں
زمینوں کی ان بے کراں وسعتوں
اور شہروں کی ایک اک گلی سے
نجانے کہاں مجھ کو لے کر چلی ہیں۔

میں طوفان کی قوتوں میں گھری
شہر کی بلڈنگوں کے مکانوں، مکینوں کی بو سونگھنا چاہتی تھی
مگر — !
کھڑکیاں، در، دریچے — سبھی بند تھے
اور میں
اپنے لاچار، مجبور، بے حس خیالات کی نوحہ گر!
بس — !
کچھ ایسی ھی چیخوں کو کانوں کے پردے سے ٹکراتا محسوس کرتی رہی
جیسے اس شہر کے ہر مکان اور در بند کروں کے پیچھے
مہذب خواتین کے اسقاط کا درد حد سے سوا ہو چکا ہے۔

ری برتھ آف کرائسٹ

بانی

مرا ہاتھ اِک سمندر ہے
مری سخت انگلیاں صدیوں پرانی برف کی شفاف قاشیں ہیں
مرا چہرہ گزرتے وقت کا خالی جزیرہ ہے

مرے دو بازوؤں کے درمیاں
گہری خلیجِ بے تموج ہے
مرے سینے کا یخ آلود سناٹا
مقفل آرزو کو سانس تک لینے نہیں دیتا

مجھے مت چھو — مجسم برف ہوں میں — برف میں تحلیل ہونے دے
مجھے سونے دے — راتوں رات مجھ کو پھول میں تبدیل ہونے دے

جدید نظم گو

میرے احباب میں اِک شاعرِ کم نام بھی ہے
ذہن ہے جس کا عجب راحت گہ
حادثے ایک زمانے کے جہاں آ کے سکوں پاتے ہیں

جب چمک اٹھتے ہیں کچھ حادثے اظہار کی پیشانی پر
وہ سمٹتا سا چلا جاتا ہے
یعنی ہر نظم اسے اور بھی بیگانہ بنا دیتی ہے

شب ، نئی نظم لیے بیٹھا تھا احباب کے بیچ
سب ہمہ تن گوش اسے سنتے تھے
نظم کے بعد وہ عالم تھا کہ سناٹا نہ کروٹ لے پائے
(نوٹ : غیر پسندیدگی کی وجہ سے)
اس نے یوں دیکھا انہیں داد طلب نظروں سے
جیسے اس آس میں ہو
گل کے گرنے کی صدا فرش سے آئے گی ابھی !

عذاب

ماجد صدیقی

میتھوں ودھ وی ایتھے ہوسی
کیہڑی ہور بلا
ہور کسے دا ڈر نہیں جنھوں
اپنے ای آپ دا تراہ

مُونہوں گنگا دکھ

لمی سڑک تے آل دوالے بھرے بھراتے رُکھ
بس دے اندر آ کرے ہوئے کئی قساں دے مکھ
بس دے شیشے اندر لشکے دو اکھیاں دا سکھ
بس دے ٹکٹ تے لکھیا ہویا مونہوں گنگا دکھ

اک ساھمنا

اکھاں نیں کہ غضب اے خدا دا !

آج کا کام کل پر چھوڑنے والوں کے نام

محمد سلیم الرحمٰن

امید پہ دنیا قائم ہے لیکن کب تک
چپ چاپ رہیں۔
امید کا پھل جب پک نہ سکے، اس کی تلخی
ہم کیسے سہیں؟

ہم ظلم کا رونا روتے ہیں گھر گھر جا کر،
اور گھر آ کر
ظالم سے ہمیں کچھ کہتے ہوئے رہتا ہے بہت
جھگڑے کا ڈر۔

ہم مظلوموں کا ہاتھ پکڑنے سے اتنا
کیوں ڈرتے ہیں؟
ادھ کچرے سے جذبوں میں مگن ہم پوری طرح
نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔

یہ طفل تسلی اور پھوکے نعروں کی جھڑی
صاحب کب تک؟
جو ظالم سے ہیں دست و گریباں وہ آخر
جائیں گے تھک۔

آ پہنچا وہاں دھارا خوں کا مظلوموں کی
گردن گردن؛
یاں پوچھتے پھرتے ہیں دنیا سے ظالم کا
ہم چال چلن۔

جب چڑھ کر دامن گیر ہو کل مظلوموں کے
خوں کا دریا،
یہ نہ ہو کہیں کچھ داد نہ اس کو ہم سے ملے
اک چپ کے سوا!

تفتیش

خالدہ اقبال

مٹی سے اٹی سرخ اینٹوں کا برآمدہ ایسی ہی اینٹوں کے چار ستونوں پر کھڑا تھا اور اس کی پشت پر قطار میں چار تنگ دروازوں پر نیلے پردے لگی چقیں گری تھیں، اس طرح کہ ان کے اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بیچ کے دو دروازوں کے درمیان لکڑی کی سخت اور گرم کرم خوردہ کرسیاں تھیں — پانچ۔ اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔

بیٹھ کر اس نے دیکھا کہ پہلے سے دو اور بھی وہاں بیٹھی ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی تک صابن کی اینٹھن تھی اور ناخنوں کے قریب قریب جلن ہوتی تھی اور ہاتھوں کو آپس میں ملنے سے کھسر کھسر کی آواز آتی تھی۔ لمس کی بھی آواز ہوتی ہے اور بدل جاتی ہے۔ پہلے جب ہاتھ آپس میں ملے جاتے تھے تو گرم نرم مہکتا لمس اٹھتا تھا، اب لکڑی کا سا بھورا خشک — مگر یہی لمس اسے بھایا تھا۔

"میرا منا گھر میں اکیلا ہے اور پکارتا ہے، میں جا رہی ہوں۔" پہلے سے بیٹھی دونوں میں سے ایک نے کہا مگر وہ برقع پہنے تھی اور اس کی آواز بھی دور سے آتی تھی۔ نقاب کے پیچھے اس کی صورت کی جھلک سی بھی نہ پڑتی تھی۔ اس نے تھک کر نظریں زمین پر جھکا دیں اور زمین پر جھکتے ہوئے اس کی نظریں چپلوں میں پڑے پاؤں پر رکیں۔ ناخنوں کی گلابی پالش جگہ جگہ سے چھٹ گئی تھی اور نیچے سے بے رنگ خشک ناخن چتکبرا نمونہ بناتے تھے۔ اس نے عرصے سے ہاتھ پاؤں کا سنگار نہ کیا تھا — مگر یہی ہاتھ پاؤں اسے بھائے تھے۔

"میرا منا بھی گھر میں اکیلا ہے اور پکارتا ہے اور ہنڈیا چولہے پر رکھی ہے۔ ضرور جل گئی ہے — مجھے بو آ رہی ہے۔"

پہلے سے بیٹھی دوسری بھی برقعے میں تھی اور اس نے سر اونچا کر کے ہوا میں زور زور سے سونگھ کے کہا تھا۔

' کیا مجھے بھی کچھ کہنا چاہیے ؟ ' اس نے سوچا اور چپ رہ گئی - بولتے ہوئے اسے سستی آ رہی تھی - اس کی زبان مدتوں سے دانتوں بیچ بند تھی اور اب ایک ایک لفظ بخیے کی طرح گوشت میں اترتا تھا -

'' سنو سنو ! وہ رو رہا ہے - میری جان -'' پہلی کرسی پر تڑپی ، اٹھی — مگر پھر ہاتھ مل کے بیٹھ گئی -

'' ابھی اور کتنی دیر ہے ؟ یہ کیا مذاق ہے ؟ '' دوسری نے چلا کے کہا -

اور اب ہاتھ میں پرچہ پکڑے محرر آ گیا -

'' محترمہ کچھ دیر اور صبر کیجیے - بس ابھی گھنٹی بجتی ہے -''

'' یہ اچھی مصیبت ہے - آخر ہمیں گھروں سے پکڑ کے کیوں لایا گیا ہے اور پھر جو کچھ آپ کو پوچھنا ہے پوچھ کیوں نہیں ڈالتے ؟ سنو سنو ! میرا منا روتا ہے -'' پہلی عورت نے بے تابی سے پہلو بدلا مگر محرر ایک چق کے پیچھے غائب ہو گیا اور برآمدے میں پھر مٹی اٹی چپ پھیل گئی جو کانوں سے ہوتی اندر اترتی تھی - اس نے پہلے سے بیٹھی دونوں کو دیکھا اور امید کی کہ شاید وہ پھر بولیں - مگر اب وہ دونوں ہاتھوں میں تھوڑی ٹکائے اونگھ رہی تھیں اور ان کے نقاب ہلکی ہلکی ہوا میں جھولتے تھے ، مگر اس طرح نہیں کہ کسی طرح ان کے چہرے کی جھلک نظر آ جائے -

' یہ اچھی بات ہے — مجھے یہاں نقاب میں آنا چاہیے تھا -' اس نے اپنے ننگے چہرے پر ہاتھ پھیر کر سوچا - ' اب یہ دونوں مجھے دیکھ سکتی ہیں اور میں انہیں نہیں دیکھ سکتی - میں نہیں کہہ سکتی کہ میرے ساتھ اور کون کون تھا - کون کون نہیں بلکہ کیا کیا چہرے تھے — مگر یہ میرا چہرہ یاد رکھیں گی اور جب بھی اس دن کو یاد کریں گی میرا چہرہ بھی انہیں یاد ہوگا کیونکہ آدمی کسی کو نہ بھی جانے تب بھی چہرے کو جانتا ہے - صرف چہرہ — گردن سے الگ تھلگ — یاد میں رہ سکتا ہے اور جب آدمی آدمیوں کو بہت جاننے لگے تو وہ بھی چہرے رہ جاتے ہیں — آخر میں صرف چہرہ ہے - مگر چہرہ خود بھی زندہ نہیں رہتا ، کسی

دوسری دیکھنے والی آنکھ میں زندہ رہتا ہے ۔ اس لیے آنکھ سے محفوظ رہنا چاہیے کیونکہ وہ دیکھتی اور دکھاتی ہے ۔ اب میں ان کی آنکھ میں زندہ رہوں گی اور ان کی آنکھ میں کا میرا چہرہ میری آنکھ میں زندہ رہے گا اور اس سے چھٹکارا نہیں ہو گا ۔ مجھے یقیناً یہاں برقعے میں آنا چاہیے تھا ۔ مگر اتنی مہلت ہی کہاں ملی ؟ میں تو کسی کو بتا بھی نہیں سکی ۔ ابھی میں نے ٹب میں صابن گھولا تھا اور جھاگ نکال کر میلے کپڑے اس میں ڈالے ہی تھے ۔ جینے سودا لینے بازار گئی تھی اور گھر کے سب دروازے بند تھے ۔ سونے کے کمرے میں ان کے کپڑے پھیلے تھے ، جیسے کہ روز دفتر جاتے ہوئے وہ پھینک جاتے ہیں ۔ شیو کا ڈبہ کھلا پڑا تھا ۔ بستر بے ترتیب تھے اور استری کے کپڑوں کا ڈھیر لگا تھا ۔ ابھی مجھے سب کچھ سمیٹنا تھا ــ مگر میں نے کپڑوں کو صابن میں ملایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی ۔ دستک دروازے پر آج تک نہ ہوئی تھی ۔ باہر گھنٹی لگی ہے ، ہمیشہ وہی بجتی ہے ۔ دستک ہوئی اور دیر تک ہوتی رہی ۔ میں گھر میں اکیلی تھی اور دستک کا جواب ناممکن تھا ۔ میں خاموش رہی اور اب میں سمجھتی ہوں کہ خوف زدہ بھی تھی کیونکہ بار بار سب دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف دیکھتی تھی کہ خوب اچھی طرح بند ہیں اور پردے پوری طرح کھنچے ہیں اور کہیں سے کچھ بھی نظر نہیں آ سکتا ــ کوئی لاکھ کوشش کرے جب بھی نہیں ۔ اور اطمینان کرنے کو میں اور بھی دیوار کے ساتھ کونے میں دبک گئی تھی اور سانس روک لی تھی ۔ اس طرح کونے میں دبکنے اور بند دروازوں ، کھڑکیوں ، کھنچے پردوں اور اندھیرے میں رہنے سے آدمی بالکل اور ہو جاتا ہے ــ جیسا کہ وہ روشن کمروں اور کھلے دروازوں اور آتی جاتی ہوا اور لو میں ہوتا ہے اس سے بالکل اور ــ اور بالکل اور ہو کر آدمی کی تھکان اترتی ہے ، وہ سو سکتا ہے ــ گہری ، بے مقصد نیند اور وقت کا خوف اسے نہیں رہتا ــ وقت کے عذاب سے وہ نجات پا لیتا ہے ، وقت اس پر حاوی نہیں ہو سکتا اور عورت پر وقت کو کبھی حاوی نہیں ہونا چاہیے ۔ یہ میں نے بالآخر سیکھا اور جب سیکھ لیا تو مجھے پتا

چلا کہ اب تک وقت کی ہلاکتوں کا سامنا میں بے کار میں کرتی رہی کیونکہ اصل میں میں وقت کی ہلاکت کا سامنا نہیں کرنا چاہتی اس کے خوف سے آزاد ہونا چاہتی تھی کیونکہ عورت نے جب وقت کی ہلاکت کا احساس کیا اور اس کے خوف کا ذائقہ چکھا وہ مردود ہو گئی اور ایسی عورت کے بارے میں حکم دستور ہے کہ اس کے ساتھ جیسا کہ ضروری ہے سلوک روا رکھو ، یہاں تک کہ وہ راہِ راست پر آئے اور بالکل اور ہو جائے ۔ اس لیے میں نے سانس لی تھی اور کونے میں دبک گئی تھی اور کونے میں کی سفیدی اور گرد میری ناک میں خارش کرتی تھی ، مگر میں کھڑی رہی ــ کھڑی رہی جب تک کہ دستک ہوتی رہی ، اور آخر دستک بند ہوگئی ۔ میں نے کھل کر سانس لی مگر میری نظر دروازے کی دہلیز پر رک گئی ۔ اس کی جھری میں سے روشنی کی تیز کٹار لکیر اندر آترتی تھی اور مٹی کے ذرے اس میں اڑتے تھے ۔ اسی لکیر کے راستے وہ پرچہ اندر دھکیلا گیا تھا ۔

' پرچہ دھکیلنے والا تیز تیز قدم اٹھاتا چل دیا تھا ۔ میں نے پرچے کو زمین پر اوندھا پڑے دیکھا اور پھر تمام گھر کے دروازے آنکھوں سامنے لائے ۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا ۔ ان سب کی دہلیزوں میں تیز کٹار لکیریں اندر پڑتی تھیں اور مٹی کے ذرے ان میں اڑتے تھے ۔ میں نے سوچا جمیل آئیں گے تو ان سے کہوں گی ۔ ہاتھ تولیے سے پونچھ کر میں نے وہ پرچہ اٹھایا اور جمیل کے میز پر رکھنے لگی ــ مگر اس پر میرا نام تھا ۔

' میں نے اسے پڑھا اور حیران رہ گئی ۔ پھر مجھے زور کی ہنسی آ گئی اور اس کے بعد ایک شدید خوف مجھ پر طاری ہو گیا ۔ مجھے ایک خاص تفتیش کے سلسلے میں بلایا گیا تھا ، ملک و قوم کا مفاد جس سے وابستہ تھا اور امید کی گئی تھی کہ میں اس بلاوے سے اغماض نہ کروں گی کیونکہ اس صورت میں میرے متعلق تمام تفصیلات محکمے کے پاس پہلے سے موجود ہیں ۔ مگر میں گھر میں اکیلی ہوں اور جمیل نہیں جانتے مجھے یہ پرچہ آیا ہے ۔ اور اگر جمیل کو معلوم ہوگیا کہ میں کسی قسم کی تفتیش میں ملوث ہوں تو ؟ وہ ایک

سرکاری ملازم ہیں اور اصولوں کے سختی سے پابند ـ مجھے نہیں جانا چاہیے ـ میں تیزی سے کپڑے دھونے لگی مگر بلاوے سے اغماض کی صورت میں میرے متعلق تمام تفصیلات محکمے کے پاس موجود ہیں ! شاید کوئی شہادت دینا ہو ـ مگر میں تو کچھ دیکھتی ہی نہ تھی ، کچھ سنتی ہی نہ تھی ، پھر شہادت کیسی ! کیا مجھے جانا چاہیے ؟ میں اکیلی تھی اور کوئی مجھے بتانے والا نہیں تھا ـ کیا مجھے جانا چاہیے ؟ آدمی کو کبھی کوئی نہیں بتاتا کہ اسے جانا چاہیے ـ وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں بتاتا ـ مگر پھر بھی وہ جاتا ہے یا نہیں جاتا ـ میں ٹب پر جھکی بیٹھی رہی ، مگر اچانک میرے پیٹ کے نچلے حصے میں ایک گرم دھڑکن اٹھی ، کوئی گرم گرم لہر دھڑک تڑپ کر چھپ گئی ـ میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور وہ نبض پھر میری انگلیوں تلے تڑپی ، لہو کی لہریں میرے کانوں کی طرف لپکیں ـ میں اکیلی نہیں تھی ـ اکیلی نہیں تھی مگر کوئی دوسرا میرے ساتھ نہ تھا ـ کیا مجھے جانا چاہیے ؟ میں نے پھر کہا اور پیٹ پر ہاتھ رکھے رکھے سو گئی ـ سو گئی ایک گھری ، لمبی ، بے مقصد نیند ـ مگر جب میری آنکھ کھلی تو میرے پاؤں چل رہے تھے ـ یہی چپلوں میں پھنسے پاؤں اور محرر مجھے اس کرسی پر بیٹھنے کو کہہ رہا تھا ـ اب مجھے یاد آتا ہے میں نے گھر میں تالا تک نہیں ڈالا ـ وہاں پر وہ سب چیزیں ہیں جنھیں میں دن رات بناتی سنوارتی ہوں اور آج کل عجیب و غریب قسم کی چوریاں ہو رہی ہیں ـ اور سب سے بڑھ کر اگر جمیل دفتر کے آدھے وقت میں گھر آ گئے اور ان پر کھل گیا کہ میں ایک تفتیش میں ملوث ہوں ؟ مگر سب سے پہلے تو جینے آئے گی ـ آئے گی اور حیران ہو گی کہ میں باہر نکلی ہوں ـ اور اگر جمیل کا گزر اس طرف سے ہو اور وہ دیکھیں کہ میں ایک سازش ، ایک تفتیش میں ملوث ہوں ؟ مگر یہاں اور بھی ہیں ـ اور بھی ہیں لیکن نقاب میں ـ مجھے نقاب میں آنا چاہیے تھا ـ مگر میں نے کبھی آج تک نقاب کو اپنے چہرے سے نہیں چھوایا ـ'

" سنو سنو ! میرا منا روتا ہے ـ" آواز سے وہ جاگی تو اسے پتا چلا کہ چہرہ ہاتھوں میں ٹکائے وہ بھی سو رہی تھی اور پہلی

عورت پھر چلا رہی تھی ۔ مٹی اٹی چپ ٹوٹی تو اس کے کانوں کو آرام آیا مگر اس آواز کے بعد وہ چپ پھر پھیلنے لگی اور اس کے خوف سے وہ خود بھی چلا اٹھی :

"میرا گھر اکیلا ہے ۔" اس کی آواز خلافِ توقع بہت اونچی نکلی ۔ دونوں عورتوں نے اپنے نقابوں ڈھکے چہرے اس کی طرف گھما دیے ، یہاں تک کہ محرر بھی چق اٹھا کر باہر آ گیا ۔ "گھر اکیلا ہے ؟" محرر نے دھرایا اور پھر دونوں عورتیں اور محرر بے تحاشہ ہنسنے لگے ۔ "کبھی گھر بھی اکیلے ہوتے ہیں ، گھروں کو بھی کسی کی ضرورت ہوتی ہے ؟" پہلی عورت نے قہقہہ روک کر کہا اور پھر مارے ہنسی کے دھری ہو گئی ۔ دوسری عورت اور محرر بھی اس کے قہقہے میں شریک ہو گئے ۔

"یہ بھی ایک ہی رہی ۔"

اس کا چہرہ ٹھنڈا برف ہونے لگا ۔ گھبرا کر اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے گال رگڑے تاکہ ان میں کچھ گرمی آئے ، مگر چہرے کا لمس ٹھنڈے پتھر کا سا تھا ۔ اس نے دیکھا اس کے ہاتھ ، پاؤں ، بازو بھی زرد ، پتھریلے اور ٹھنڈے تھے ۔ اسے پھر خیال آیا : جمیل ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ، مجھ میں حاضر دماغی بالکل نہیں ۔ ایک گمنام قسم کی تفتیش کے سلسلے میں آنا اور بغیر انتظام کے ! مجھے نقاب میں آنا چاہیے تھا ۔ پھر میں کچھ بھی کہتی ، یہ سب کتنا ہی ہنستے ، کوئی بات نہ تھی ۔ اور یہ شاید ہنسے بھی اس لیے ہیں کہ میں انہیں نہیں دیکھ سکتی اور یہ مجھے دیکھ سکتے ہیں ۔ بے چینی گرم بھاپ کی طرح اس کے پیٹ میں بل کھا کر اٹھی ۔

"میرا گھر اکیلا ہے ۔" وہ پھر مضحکہ خیز بنی ۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اور عورتوں کو ہنستے ہنستے ہچکی آنے لگی ۔ محرر نے منہ کے آگے سے کاغذ ہٹا کر کہا :

"محترمہ پہلے آپ کی باری آئے گی ، ورنہ آپ تو ہمیں ہنسا ہنسا کے مار ڈالیں گی ۔"

تو پھر شاید یہ ٹھیک ہی کہتے ہوں : گھر کبھی اکیلے نہیں ہوتے ۔ یا شاید گھر ٹھور ٹھکانے ہوتے ہی نہیں ۔ صرف بچے اکیلے ہوتے

ہیں اور ہنڈیا اور چولہے - مگر بچے تو ہم سے الگ نہیں ہوتے ۔ میرا بچہ تو مجھ سے الگ نہیں - وہ میرے خون تئیں ہمراہ ہے اور آپ ہی خون ہے - اور خون ـ مگر گھنٹی بجی ـ اس طرح کہ دیواروں میں بجلی کی لہریں سی دوڑ گئیں - محرر تیزی سے اندر گیا اور پلٹ آیا اور اس کے ساتھ ایک اور کھلے چہرے والی عورت جو زرد پتھریلی تھی اور جس کے ہاتھ سے نیلے منجمد لہو کے قطرے ٹپکتے تھے -

" آپ دونوں جا سکتی ہیں ، سب ٹھیک ہے -" محرر نے پہلے سے بیٹھی دونوں سے کہا اور وہ دونوں تیزی سے اٹھ کر تیسری عورت کے ساتھ چلی گئیں -

" محترمہ آپ تشریف لائیے -"

وہ محرر کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئی - باہر کی نسبت اندر بلا کی تیز روشنی تھی - اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں -

" تشریف رکھیے -"

• مگر اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا - اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر راستہ ٹٹولا -

" بس ٹھیک ہے -" آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی بجلی کا سوئچ کوئی کہیں بند ہو گیا اور کمرے کی روشنی کم پڑ گئی - اس نے دیکھا کہ وہ پانچ آدمیوں کے سامنے کھڑی ہے اور ان میں سے ایک اٹھ کر چلا گیا ہے - اس نے آنکھیں ملیں -

" یہ سرچ لائٹ تھی محترمہ ، ابھی اس کا اثر دور ہو جائے گا - تشریف رکھیے - یہ دیکھیے، کیا آپ اسے پہچانتی ہیں ؟ "

دائیں ہاتھ کے پہلے آدمی نے ایک کاغذ اس کی طرف سرکایا ، اس پر ایک تصویر چسپاں تھی - اس نے اٹھا کر قریب کی -

" ہاں یہ میرا چہرہ ہے -"

" گڈ -" آدمی نے تصویر واپس لے لی اور سامنے رکھے موٹے بڑے رجسٹر میں کچھ درج کرنے لگا -

" محترمہ ! " اب دوسرے نے گلا صاف کیا ، " ہمارے پاس وقت تھوڑا ہے ، اگر آپ ہمارے سوالوں کا جلد اور صحیح جواب دیں تو اس میں ہمارا ، آپ کا اور قوم ، ملک ، سبھی کا فائدہ ہے -"

" جی ہاں ۔" اب تیسرا اٹھا اور اس نے بے شمار بٹنوں اور سوئیوں والی ایک مشین سامنے میز پر لا رکھی اور پھر ایک تار اس کی دائیں کلائی پر نبض میں پیوست کر دیا ۔ اسے یوں لگا جیسے نشتر اتر گیا ہو ۔

" گھبرائیے نہیں ۔ یہ سچ جھوٹ جانچنے کا آلہ ہے ۔ بہتر ہے کہ آپ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کریں ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک دوسرا تار اس کے سینے میں دل کے قریب اتار دیا ۔ خون کے گرم قطرے لڑھک کر اس کے پیٹ پر پھیل گئے ۔

" محترمہ ہمارا سوال بالکل سیدھا ہے ۔ آپ کب سے اس گروہ میں شامل ہیں ؟ "

چوتھے نے رجسٹر کھولا ۔

" گروہ ! کون سا گروہ ؟ " اس نے حیرت سے پوچھا ۔

" یہ تو پھر وہی مصیبت ہے ۔ کام لمبا ہے ۔" پہلے نے باقی تینوں سے کہا اور چوتھا تیوری چڑھا کر بولا :

" دیکھیے محترمہ ، آپ سب کچھ جانتی ہیں ۔ چیزوں اور ناموں کی وضاحت ہمارا کام نہیں ، ہم تو سیدھا سوال کرتے ہیں اور سیدھا جواب چاہتے ہیں ۔ ہماری زبان سادہ ، الفاظ سیدھے سادے ہیں ۔ آپ کب سے اس گروہ میں شامل ہیں ؟ "

" گروہ ! " وہ سوچ میں پڑ گئی مگر اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں گرم گرم دھڑکن تڑپی اور تڑپ کر چھپ گئی ۔ اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا ۔ اچانک مشین پر لگی سرخ بتی ٹمٹمانے لگی ۔ سامنے بیٹھے سب نے ایک دوسرے کی طرف فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھا ۔

" کیا اب بھی آپ ہمارا مطلب نہیں سمجھیں ؟ " چوتھے نے طنزیہ کہا اور باقی تینوں زور سے ہنس دیے ، یہاں تک کہ پیچھے کھڑا محرر بھی ۔

" گروہ ؟ دیکھیے میں ایک گھریلو عورت ہوں ۔ اب بھی میرے ہاتھوں میں صابن کی مہک ہے اور میں کپڑے دھوتی آئی ہوں ۔ کسی گروہ میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ میرے گھر کی تمام کھڑکیاں ، دروازے چوبیس گھنٹے بند رہتے ہیں ۔

میں ایک سرکاری ملازم کی بیوی ہوں جو اصولوں کا سختی سے پابند ہے ۔ اور گھر میں جب کام نہیں کرتی تو لمبی گہری نیند سوتی ہوں ۔ میرے ہاتھ پاؤں ایک محنتی عورت کے ہاتھ پاؤں ہیں ۔ آپ دیکھ سکتے ہیں ۔ گروہوں میں شامل ہونے کا میرے پاس وقت ہے نہ ضرورت ۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو مہربانی ہو گی ۔ میں گھر میں تالا ڈالنا بھول آئی ہوں ۔'' اس نے تیزی اور غصے سے کہا ۔

'' آپ کی ہٹ دھرمی یہاں نہیں چلے گی محترمہ ۔'' دوسرے نے تنک کر کہا ، '' آپ کی یہ حرکت آپ کے خلاف گواہی دیتی ہے ۔ ہمارا یہ آلہ کبھی غلط نتائج نہیں دیتا ۔ اس کی مسلسل سرخ روشنی دیکھیے اور ہمیں کسی اور رویے پر مجبور نہ کیجیے ۔''

یک دم خون کی لہریں اس کے کانوں تک یورش کرنے لگیں اور تمام جسم میں نبضیں دھڑک اٹھیں ۔ 'تو کیا سچ مچ وہ اس گروہ میں شامل ہے ؟ ' اس نے سوچا اور اس سوچ کے ساتھ اس کے دماغ کی تمام نسیں پھول گئیں ۔ '' کیا میں اس گروہ میں شامل ہوں ؟ '' اس نے چاروں ہی سے پوچھا اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے ۔ سامنے دیوار پر لگی گھڑی ٹک ٹک بولنے لگی اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی ، جب کہ اب سے پہلے وہ خاموش تھی یا وہاں تھی ہی نہیں ۔ چلتی سوئیاں دیکھ کر اس کا جسم لرز گیا ۔ وقت ۔ وقت اس کی رگوں میں تھا اور اس پر حاوی تھا ، اس کی شہ رگ سے پھٹا پڑتا تھا ۔

'' ہاں ۔'' اس نے بدلتی آواز میں کہا ۔ سب کے چہرے اطمینان اور توقع سے چمک اٹھے اور وہ مشین کی طرف دیکھنے لگے ۔ اس نے بھی دیکھا اور پھر ان سب کو ۔ پل بھر میں چہروں کا اطمینان اور توقع مدھم پڑنے لگ گئے تھے ۔ مشین خاموش تھی ۔ اس کے سبز اور سرخ دونوں بلب اندھے تھے ۔

'' کیا بات ہے ؟ '' پہلے نے بے تابی سے کہا اور تیسرا بے تحاشا ادھر آدھر کے بٹن دبانے لگا ، مگر مشین خاموش تھی ۔

'' کب سے ؟ '' دوسرے نے پھر اصرار کیا ۔

'' کب سے ؟ معلوم نہیں ۔'' اس نے کہا ۔

سب سانس روکے مشین کی طرف دیکھنے لگے اور پھر ان چاروں

کے چہرے پر مایوسی اور تھکن کی جھریاں گہری ہو گئیں ۔ وہ مرجھائی نظروں سے اس آلے کی طرف دیکھتے رہے جس پر اب سرخ بلب ہولے ہولے جل بجھ رہا تھا ۔

" مشکوک کے خانے میں ڈال دو ۔"

آخر سب سے بڑے نے کہا اور قلم رجسٹروں پر چلنے لگے ، جب کہ مشین پر سرخ بلب جل بجھ رہا تھا ۔ تیسرے نے اس کے سینے اور نبض میں سے تار نکالے جن کی نوک پر لہو کے زرد قطرے تھے ۔ اور زخموں پر مہر لگا دی ۔

" آپ جا سکتی ہیں محترمہ ۔"

وہ اٹھی ۔ دیوار پر گھڑی بند تھی ، اس کی سوئیاں جم گئی تھیں اور اس کی کلائی اور دل پر نیلے نشان تھے ۔

* * * * * * * * *

خانے اور تہہ خانے

غیاث احمد گدی

کلا نے ایک لمحے کو ہوٹل کی طرف غور سے دیکھا اور زیرِ لب بولی : " یہی وہ جگہ ہے ! "

شرت نے آگے بڑھ کر آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا : " تم یہاں آ چکی ہو ؟ "

سوال نہایت معمولی تھا اور شرت نے پوچھ بھی یوں ہی لیا تھا لیکن کلا یہاں پھر چونک اٹھی اور پلٹ کر شرت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے جمے ہوئے لہجے میں جواب دیا : " نہیں ۔ "

پھر دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے ۔ یہ عین اتفاق تھا کہ جب کلا نے مینیجر سے پوچھا : " گیارہ نمبر خالی ہے ! " تو اس نے اثبات میں جواب دیا ۔

ایک گہری دودھیا دھند سی چاروں طرف پھیل گئی ۔ کلا اپنی روح کو بے چینی سے بچانے کے لیے شرت کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف چل دی ۔

باہر بارش ہو رہی تھی ـ لگاتار بارش : بمبئی کی اکتا دینے، کسی زخمی دل کی طرح ہولے ہولے رستے رہنے والی بارش ـ جس سے نہ کیچڑ دھلتی ہے نہ گندگی بہتی ہے بلکہ ایک مسلسل حبس رہتا ہے جس میں آدمی کا وجود بلکہ اس کی روح تک گرفتار رہتی ہے ۔

اگرچہ شرت نے پہلے ہی بہت سمجھایا تھا کہ اول تو یہ موسم ہی اس لائق نہیں کہ ہنی مون منایا جائے ، پھر اگر ہنی مون منانا ہی شرط ہے تو یہ بمبئی کون سی جگہ ہوئی ، بہت سے مقامات ہیں ؛ لیکن کلا تل گئی : " نہیں ، بمبئی جائیں گے ۔ میں نے عہد کر رکھا تھا کہ ہنی مون بمبئی میں منائیں گے ۔ "

بستر پر سفید دودھ کی طرح چادر بچھی تھی جس میں یہاں سے وہاں تک کوئی شکن نہیں تھی ۔ کلا کے بے قرار ذہن میں یکایک

ایک استعارہ چمک اُٹھا لیکن اس نے اس کا اظہار کرنے سے پہلے شرت کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے پوچھا : '' اچھا بتاؤ تو اس بے شکن چادر کو دیکھ کر تمھارے دماغ میں کون سی تشبیہ آتی ہے ؟ ''

'' کیا مطلب ؟ یہ یکایک کیا بے تکی بات پوچھ رہی ہو ؟ ''

'' تم نہیں بول سکتے نا ، میں بتاؤں ؟ ''

'' بتاؤ ۔'' اس نے لاپروائی سے جواب دیا ۔

'' اس بستر کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ کسی حسینہ کا کنوارہ بدن ہے اور اس انتظار میں ہے کہ ...''

شرت ہنس پڑا ۔ کلا کے خوبصورت ذہن نے اس کے اپنے ذہن میں گدگدی پیدا کر دی ۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور کلا کو اپنی باہوں کی لپیٹ میں لے لیا : '' واقعی تم کلا ہو ۔ ''

ایک ناگوار سی لذت کے احساس سے اس کا وجود بھیگ گیا ۔ وہ ہنستے ہوئے شرت کی باہوں سے نکل بھاگی اور سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو کھول دیا ۔ روشنی کا ایک ریلا اندر آ گھسا ۔ باہر دور دور سمندر ہی سمندر تھا ــ گہرا نیلا ، کسی پُر شکن بستر کی طرح تا حدِ نظر پھیلا ہؤا ، جس کی خاموش سطح پر بارش مسلسل سر دھن رہی تھی ۔

کلا کھڑکی کے سہارے کھڑی باہر کی جانب دیکھے جا رہی تھی ۔ اس کے دل کی دنیا میں دور دور تک گلاب ہی گلاب کھل رہے تھے ۔ ایسے میں دل کی دنیا سے اٹھ کر مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی ۔

اس نے پلٹ کر دیکھا ، کمرے میں اس کا شوہر نہیں تھا ۔

کمرے میں وہ اکیلی تھی ۔ اس کا شوہر شرت اندر باتھ روم میں تھا ۔ باتھ روم سے وہ خود ابھی نکل کر آئی تھی ۔ اس کے کپڑے سوکھے تھے مگر جسم ابھی تک گیلا تھا اور اس کے گھنے بالوں میں سے پانی کی ایک آدھ بوند گاہے گاہے ستارے کی طرح ٹوٹ پڑتی ۔ اس کا سارا بدن ، ساری آتما بھیگی بھیگی تھی ۔ اندر باہر سب گیلا تھا ــ سمندر کے وجود کی طرح ۔

ابھی شرت اندر باتھ روم میں نہا رہا تھا ۔ اس کے گنگنانے کی

آواز کمرے میں تیر رہی تھی - باہر بارش سمندر کے سینے پر لگاتار زخم لگا رہی تھی - ابھی وہ ، اس کا شوہر ، شرت ، باتھ روم سے نکلے گا اور بے ساختہ اسے اپنے بازوؤں میں کس لے گا - اس وقت اس کا یہ بھیگا بھیگا سرد جسم آگ کی طرح دھک اٹھے گا اور وہ بے ہوش سی ہو کر اس کی آغوش میں گر پڑے گی اور ... اور ... اور یہاں پہنچ کر کلا کا دماغ شراب کے گہرے جھٹکے سے مست و بے خود ہو گیا -

مگر ایسا نہیں ہؤا - ایک خواب سا اس نے لمحہ بھر پہلے دیکھا اور اس کی آنکھ کھل گئی - سامنے شرت آئینے کے قریب کھڑا اپنے بھیگے بالوں کو تولیے سے خشک کر رہا تھا اور دھیرے دھیرے کچھ گنگنا رہا تھا جس کے الفاظ کلا تک نہ پہنچ پا رہے تھے - اس نے کہا : '' یہ تم کیا گا رہے ہو - غالب کا کوئی ....''

'' نہیں ، ایک فلمی دھن ہے بھئی -''

'' ھش ، فلمی دھن بھی کوئی چیز ہوئی - تم بھی عجیب چیز ہو - تمہارے ذہن میں کوئی خوبصورت بات بھی پیدا ہوتی ہے یا نہیں -''

وہ ہنس پڑی - '' ابھی ایک تشبیہہ کو پوچھا ، وہ بھی نہیں بتا سکے -''

'' اچھا میری طرف دیکھ کر کہیے تو ...؟ ''

جواب میں شرت نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ایک لمحے کو دیکھتا ہی رہ گیا - پھر لپک کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا - پھر کہیں سے دھنک سی پھیل گئی : سات رنگوں والی لچکیلی کماں جو اس کے وجود میں گھلنے لگی اور کلا نے محسوس کیا کہ شرت ... اس کے خواب ...

(۲)

جب بمبئی کی بات چلی تو کلا ہی نے پہلے کہا : '' پتا نہیں کیا شہر ہے - اتنے ہنگامے ، اتنے شور شرابے میں بھی سناٹے کا احساس رہتا ہے -''

'' لو ، یہ تمہارے تأثرات ہیں بمبئی کے بارے میں ! یہاں آنے سے پہلے تو کہہ رہی تھیں کہ دنیا میں کوئی شہر ہو سکتا ہے تو بمبئی -''

کلا بلا وجہ چونکی : '' دراصل یہ بارش کے کارن ہے - بمبئی

کی بارش بڑی بدنام ہے۔'' اس نے گردن اٹھا کر وکٹوریہ والے بوڑھے کو مخاطب کیا ، '' کیوں بابا ، کیا خیال ہے تمھارا ؟ ''

بوڑھے کوچوان نے چابک گھما کر گھوڑی کی پیٹھ پر رسید کی ، پیٹھ کی جلد پر یہاں سے وہاں تک سلوٹیں تھر تھرانے لگیں جسے دیکھ کر پتا نہیں کیوں کلا سہم گئی ، پھر خود ہی سوچنے لگی : ' ایسا کیوں ہوُا ؟ '

اس نے دوبارہ پوچھا : '' بتایا نہیں بابا تم نے ؟ ''

'' میں کیا کہہ سکتا ہوں بیٹا ۔ یہ تو اپنی اپنی طبیعت کی بات ہے ۔ اندر آگ لگی ہو تو باہر کی بارش زہر لگتی ہے ۔''

کلا شرت کے چہرے کی طرف مڑ گئی جو سگریٹ جلا رہا تھا ۔ پھر وہ ہنسنے لگا : '' بات تو بابا سولہ آنے کہہ رہے ہیں ۔ اب دیکھو ، مجھے اس بارش میں زندگی کی ہماہمی کا احساس ہو رہا ہے ... اور تمھیں ... ! ''

دفعتاً شرت نے اس کی ٹھوڑی پکڑ لی : '' اچھا بتاؤ تو تمھارے اندر کیسی آگ سلگ رہی ہے جو ... ؟ ''

'' کس نے کہا کہ میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے ۔ یہ دو پیسے کا کوچوان تو اپنے کو فلسفی سے کم نہیں سمجھتا ۔''

'' ارے تم چڑ گئیں ۔''

'' نہیں تو ...'' کلا کی زبان سے یہ الفاظ کیسے نکلے ، کتنے مشینی انداز سے کہ خود اسے اچھا نہیں لگا ۔ '' میرا مطلب ہے یہ ان پڑھ بوڑھا کیا جانے ! یہ تو خالص نفسیات کی بات ہے ۔ تم نے تو بی ۔ اے ۔ میں پڑھا ہو گا ؟ ''

'' نفسیات کوئی کتابوں میں ہی تو نہیں ۔'' شرت نے بڑے سلجھے ہوئے ، سمجھانے والے انداز میں کہا ، '' عام زندگی میں... عام لوگوں ... ''

'' اچھا تم لیکچر مت شروع کرو ۔ یہ کوئی تمھاری کلاس نہیں۔''

ہوا میں ایک چابک لہرائی اور گھوڑی کے ننگے جسم پر سمندر کی لہروں کی طرح شکنیں پڑ گئیں ۔

(۳)

جوہو کے ایک تاریک گوشے میں کھڑی ہو کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

" شرت ... آؤ مجھے ... بانہوں میں جکڑ لو ! " اور اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔

شرت نے ایک بار لمحے بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اسے اپنی آغوش میں بھر لیا ۔

پھر اس نے اپنے ہونٹ آگے بڑھا دیے : " اور انہیں چوم لو ۔"

شرت نے ایسا ہی کیا ۔ ایک طویل ، گہرا بوسہ ، مگر کلا بیچ ہی میں اکتا گئی ۔

" بس ! " اور الگ ہٹ گئی

شرت کی تیوریاں چڑھ گئیں : " کیوں ؟ کیا ہؤا ؟ "

" کچھ نہیں ... کچھ ویسا نہیں لگا ! "

" کیسا ؟ "

" بس ویسا ، " اس نے فوراً جواب دیا ، " جیسا میں نے سوچا تھا ۔"

" کیسا تم نے سوچا تھا ۔ یوں اوٹ پٹانگ پاگلوں کی طرح کیوں سوچتی ہو ؟ "

کلا نے اس سوال کا جواب نہیں دیا ۔ اس وقت اس کا ذہن خالی تھا ، تنہائی اور سناٹے کے احساس سے جکڑا ہؤا ۔

پھر وہ بہت دیر تک گھومتے رہے ۔ سمندر میں دوڑ دوڑ کر ڈوبنے ابھرنے والے ٹیڈی لڑکے لڑکیوں کو دیکھتے رہے ۔ بھیل والے سے بھیل خرید کر کاغذ کے لفافے کو تھامے کھاتے رہے اور ہنستے رہے ، لیکن کلا کی روح بے چینیوں اور بے قراریوں کی گرفت میں تھی ۔ اسے یہ سب کچھ اچھا لگتے ہوئے بھی بے جان اور اکتا دینے والا لگ رہا تھا ۔

" چلو شرت ، میں تھک گئی ۔"

" بس ابھی سے ۔" شرت نے پوچھا ۔

" ہاں ۔"

سوچ پر کسی کی پابندی نہیں ۔ یہ بالکل ذاتی ، نجی اور شخصی روش ہے ۔ کملا نے آرام کرسی پر اپنے آپ کو ڈال دیا ۔ اس کے شوہر شرت نے کیوں ایسا کہا کہ تم اس طرح کیوں سوچتی رہتی ہو ۔ شادی کی ہے ، اس نے بیچا نہیں ہے اپنے آپ کو ۔ ایک پوتر اگنی کو گواہ رکھ کر اس نے شرت کو اپنا شوہر سوئیکار کیا ہے... یہ بھی ٹھیک ہے لیکن ...

اس لیکن کے بعد آگے سوچنے کے لیے کوئی راہ نہیں ۔ سب راستے بند کر دیے گئے ہیں ۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ سارے راستے بند ہیں! کیا شرت ایسا نہیں سوچتا جو پتی پتنی کے درمیان والے سماجی اصولوں کے خلاف ہو ۔ اس نے بھی تو مقدس آگ کو ساکچھی رکھ کر وعدہ کیا ہے ۔

جب شرت نے پیچھے آ کر اس کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں تو بڑے ٹھیراؤ سے اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا : " شرت سچ سچ بتاؤ تو ، تم اس گھاٹن لڑکی کی طرف کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے ؟ "

شرت اس اچانک سوال کے لیے قطعی تیار نہیں تھا : " کس لڑکی کی بات کر رہی ہو ؟ " اس کی تیوریاں چڑھ گئیں ، " دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا ؟ "

" چڑ گئے نا ! " وہ ہنسنے لگی ، " مگر مجھے کوئی جلن نہیں ۔ ایسی جوان ، ایسا صحت مند جسم ، وہ بھی بارش میں سلگتا ہؤا — کوئی بھی مرد ... "

" کہو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں ! "

" کملا تم کو کیا ہو گیا ہے ! پاگل تو نہیں ہو گئیں ؟ "

کملا دفعتاً اٹھ کھڑی ہوئی ۔ یہ وہ کیا کہہ گئی ! بے چینی ، قلبی بے قراریوں نے اس کو مضطرب کر دیا ۔ یہ دماغ اس کے اختیار سے نکلا جا رہا ہے ۔

پھر وہ جھینپ مٹانے کے لیے ہنسنے لگی ، زور زور سے قہقہے لگانے لگی ۔ شرت نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا ، اس کے قہقہوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور خاموشی سے ، اس سے کچھ کہے بنا

کمرے سے باہر نکل گیا ۔

کلا نے بھی کوئی نوٹس نہیں لیا ۔ وہ چپ چاپ کرسی پر لیٹی رہی ۔ برسات کی دھوپ ۔ بمبئی کی اونچی اونچی عمارتوں سے ڈھکی ہوئی دھوپ رفتہ رفتہ دھندلکے میں تبدیل ہوتی گئی ۔

تب وہ اندر کمرے میں آئی ۔ میز پر سے ٹن اٹھایا ۔ سگریٹ کو ہونٹوں کے درمیان پھنسانے سے پہلے دروازہ بند کر دیا ۔ پھر ماچس کی ڈبیہ سے تیلی نکالی ۔ سگریٹ کو جلانے سے پہلے خاموش اور بے جان دیواروں کو گھور کر دیکھا ، پھر ایک لمبا کش لیا ۔

یہ سب کرتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر سوچا کہ یہ کوئی مجرمانہ حرکت تو نہیں ! شرت کے سامنے بھی وہ سگریٹ پی سکتی تھی ، پھر وہ ایسے کیوں کر رہی ہے ؟ سگریٹ پینا کوئی بری بات نہیں ، پھر یہ چوری کا احساس کیوں اسے گھیرے ہوئے ہے ۔ اتنی احتیاط ، اتنی ہوش مندی !

کچھ آزادہ روی بھی ہو ، کچھ بے احتیاطی ؛ کچھ ایسی زندگی گزرے کہ ہر لمحہ جو اسے اپنے وجود کے گرد زنجیر سی پڑی محسوس ہوتی ہے وہ نہ ہو ؛ یہ احساس نہ ہو کہ اس کے سگریٹ پینے پر یا اکیلے میں اپنے بدن کے سارے کپڑے آتار پھینکنے پر کوئی اس کو ٹوک بھی سکتا ہے ، باز پرس بھی کر سکتا ہے ۔

پھر اس نے اپنے بدن کے سارے کپڑے آتار دیے : پہلے بلاوز ۔ وہ پھنسا پھنسا سا بلاوز آتارنے میں ذرا دقت کا سامنا کرنا پڑا ۔ پھر وہ تنگ بریسیر جو اس کے گول ، خوبصورت اور آلٹے ہوئے پیالوں کی طرح سڈول سینوں کو ایک لذت بخش دباؤ سے جکڑے ہوئے تھی ۔ پھر ساڑی ، پھر پیٹی کوٹ ، پھر وہ یک دم سے ننگی تھی ۔ اس نے کمرے کی بتی روشن کر دی ۔ مرمر کا تراشا ہؤا جسم ، ایڑی سے لے کر چوٹی تک چوم لیے جانے والا بدن ۔ وہ مست ہو گئی ، جیسے وہ شراب کا کوئی تیکھا سا ، بڑا سا پیگ پی گئی ہو ۔ اس کی آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں ۔

پھر کلا نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلا دیے ، جیسے کسی کو اپنی آغوش میں لے لینا چاہتی ہو ؛ کسی ننگے، خوبصورت

تراشے ہوئے مردانہ جسم کو دبوچ لینا چاہتی ہو۔

جب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ ہڑبڑا کر اس نے بستر کی چادر کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔

”کون ؟“

”میں۔ یہ کیا کر رہی ہو کمرہ بند کرکے ؟ دروازہ کھولو۔“

”ابھی کھولتی ہوں۔“ اس نے ہڑبڑا کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

”ارے ! چادر لپیٹے ہوئے ہو۔ کیا کر رہی تھیں ؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے پیشانی پر آئی ہوئی لٹ کو پرے پھینکتے ہوئے اطمینان سے کہا ، ”ذرا نہانے کی تیاری کر رہی تھی۔“

”کمرہ بند کر کے ، باتھ روم... ؟“

”افوہ ! تم تو شرت بال کی کھال نکالنے لگتے ہو۔“ کلا نے اچانک محسوس کیا کہ اس کا لہجہ ویسا نہیں ہے۔ وہ زبردستی ہنسنے لگی۔ ”اب جی چاہا ... ذرا تمہارا یوں انتظار کر لوں ...“

باہر بارش شروع ہوگئی تھی۔ رم جھم رم جھم مینہ۔ ساری فضا حبس اور گھٹن کی گرفت میں تھی۔ کلا نے کھڑکی کھول دی اور سامنے تاریک سمندر کی سطح پر نظریں جما دیں جس پر ہوٹل کی رنگین بتیاں جب روشن ہوتیں خون سا چھڑک دیتیں ، جب بجھ جاتیں خاک ڈال دیتیں۔ دیر تک وہ گھورتی رہی اور اپنے ذہن کے اندھیرے کمرے میں کوئی خوبصورت سا استعارہ ڈھونڈتی رہی ، مگر تھک گئی۔ وہ جو روشنی کا ایک منبع سا اس کے دماغ کی دنیا میں پھوٹ نکلا تھا اس کا منہ ہی بند ہو گیا ہے۔

کلا نے محسوس کیا جیسے جیسے بمبئی کے شب و روز گزر رہے ہیں پھیکے پھیکے ہوتے جا رہے ہیں ، اس کی اکتاہٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ جس چاؤ سے وہ یہاں آئی تھی ، جو کشش اسے بمبئی لے آئی تھی ، یہاں ، اس ہوٹل میں ، سمندر کے کنارے وہ کشش ہی کھوگئی ہے۔ اسے کہاں ڈھونڈا جائے ؟

اس کے ذہن کی خاموش دنیا میں کبھی کبھی زلزلے کے جھٹکے سے ہوتے رہتے ہیں جس سے اس کی دنیا ہل جاتی ہے۔ اس نے آہستہ

سے اپنا سر شرت کے کندھے سے ٹکا دیا ۔ ٹیکسی تیزی سے گزرتی جا رہی تھی ۔ تیز اور ٹھنڈی ہوا کھڑکیوں سے آ رہی تھی ۔ کلا کی آنکھیں آپ سے آپ بند ہو گئیں ۔ شرت نے پلٹ کر ایک ذرا دیکھا پھر مسکرا پڑا ۔ اس نے بڑی محبت بھری نظر کلا پر ڈالی اور اس کے چہرے سے بالوں کو ہٹا کو سر پر جما دیا ۔ پھر ٹیکسی کب رکی ، اسے خبر تک نہ ہوئی ، لیکن ذرا دیر بعد اس کی آنکھیں آپ سے آپ کھل گئیں ۔

آگے پیچھے گاڑیاں ہی گاڑیاں تھیں ۔ کاروں کے ہارن اور انجن کی گڑگڑاہٹ کے باعث کان پڑی بات سنائی نہیں دے رہی تھی ۔ اس نے شرت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا : ”یہ گاڑیاں ؟“

جب ہی اس نے دیکھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک وکٹوریہ گری پڑی ہے اور لوگ چلا رہے ہیں ۔ اس نے دیکھا وکٹوریہ میں جتی ہوئی گھوڑی منہ کے بل زمین پر پڑی ہے اور چمڑے کی پیٹیوں کی قید سے چھوٹنے کے لیے زور لگا رہی ہے مگر چمڑے کی پیٹیاں بہت مضبوط ہیں شاید ۔ ذرا دیر بعد وہ تھک کر پسر گئی ۔

پھر کلا نے اپنے شوہر سے پوچھا : ”یہ بیلٹ بہت مضبوط ہیں نا ۔ گھوڑی تڑپ تڑپ کر مر جائے جب بھی نہیں ٹوٹنے کے ۔ کیوں ؟“

شرت نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ وہ اس سوال ہی کو سمجھ نہیں پایا کہ کلا کیا کہہ رہی ہے ۔ اچانک اگر شرت پلٹ کر اس سوال کا مطلب خود اس سے پوچھ بیٹھے تو شاید کلا جواب نہ دے سکے ۔ اس نے گہری نظروں سے کلا کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے جملے کو کم اور چہرے کو سمجھنے کی زیادہ کوشش کی ۔

اتنے میں گاڑی آگے بڑھ گئی ۔

مہابلیشور کی پہاڑیوں پر آدمی ، لگتا ہے ، جیسے بہت کچھ پا لیتا ہے ۔ زندگی ہلکی اور خوبصورت ہو کر سامنے پھیل جاتی ہے ۔ ممتا بھرے بازوؤں کی طرح اپنی آغوش میں لینے کے لیے سارا ماحول بے تاب دکھلائی دیتا ہے ۔ مگر کلا کھوئی کھوئی رہی ۔ جتنا شرت اسے اس خوبصورت ماحول کی طرف کھینچتا وہ ذہنی طور پر بھاگی بھاگی پھرتی ۔

شرت نے اس کی کئی تصویریں لیں : مختلف پوز ، مختلف زاویے سے ؛ کہیں کھڑا کر کے ، کہیں لٹا کر ، کہیں فرش پر اوندھے سلا کر ، پھر کیمرے کا آٹو میٹک کلپ لگا کر اسے چٹان پر رکھ دیا اور لپک کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا ۔ کلا تڑپنے کو ہوئی تو اس نے 'سی' کر کے کیمرے کی آنکھ کی طرف اشارہ کر دیا ۔ یہ سب چند سیکنڈ میں ہو گیا ۔ پھر کیمرے کی کررررر کرنے والی آواز کھٹ سے رک گئی ۔

" ہو گئی تصویر ! "

" ایسی تصویر ؟ " کلا کو ناگوار لگا ، " کیوں ؟ "

" ارے کیوں کا کیا مطلب ؟ یوں ہی ایک یادگار ... "

" یا شوہر ہونے کے احساس کو بنائے رکھنے کے لیے ؟ "

مگر کلا خود دنگ رہ گئی ۔ وہ کیا کہہ گئی ! شرت کا اس پر حق ہے ۔ اس کا بھی شرت پر اتنا حق ہے ۔ زندگی میں جتنا کچھ اسے شرت سے لینا ہے اتنا ہی کچھ دینا بھی ہے ۔ یہ دان اور پرتی دان کا نازک رشتہ جو پوتر اگنی کے گرد پھیرے دینے کے بعد پیدا ہوتا ہے کوئی معمولی اور ایسا ویسا رشتہ نہیں ۔ کسی اپنے — اور ایک دم اپنے — شخص کے ساتھ راتیں گزار لینے کے بعد بھی وہ بات شاید نہیں ہوتی ۔ بھگوان کی ساکھچی اور برسوں کے روایتی نظام زندگی کی کوکھ سے یہ پھول جب کھلتا ہے تو اس کی مہک سے روح زندہ ہوتی ہے ، آتما کو ایک نئی اور وشال زندگی ملتی ہے ۔

پھر شرت میں برائی کیا ہے ؟ کلا نے خاموشی سے چلتے چلتے سوچا : خوبصورت ہے ، جوان اور تندرست ہے ؛ اس کے پاس لاکھوں روپے ہیں ؛ پھر اسے چاہتا کتنا ہے ؛ کتنا ٹوٹ کر اس سے پیار کرتا ہے ؛ اس کی کسی بات کا برا نہیں مانتا ، کوئی بات نہیں ٹالتا ۔ چلتے چلتے اس نے شرت کی طرف دیکھا اور مسکرا پڑی ۔

" کیوں ، کیا بات ہے ؟ "

" کچھ نہیں ۔ " اس نے سامنے ٹھہرے ہوئے سفید بادلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ، " تم بہت اچھے ہو ! "

" اچھا ! " شرت نے ہنستے ہوئے ذرا تعجب سے کہا ،

" پسندیدگی کا شکریہ ! "

" تم طنز کرتے ہو ۔"

شرت نے زوردار قہقہہ لگایا اور لپک کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا : " برا مان گئیں ۔ میں نے کب طنز کیا ۔ تم تو کلا ان سفید بادلوں کی طرح ہو ، چاہو تو برسو ، چاہو تو پیاسوں کو تڑپاتی ہوئی آگے نکل جاؤ ۔"

کلا کو اچھا لگا ۔ بات خواہ بے تکی سہی مگر شرت نے خوبصورت ڈھنگ سے کہی تو ۔ اس کا سارا غصہ ختم ہو گیا ۔ پھر اس نے سوچا کہ واقعی وہ ان سفید بادلوں کی طرح ہے جن کو نامعلوم سا اجنبی ہوا کا ریلہ بہائے لیے پھرتا ہے ۔ وہ اپنے پاؤں مضبوط کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے ، کہیں دم بھر کو ٹھیرنا چاہیں تو نہیں ٹھیر سکتے ، برسنا چاہیں تو برس نہیں سکتے ۔ پابند ہیں... پابند ہیں ...

کلا کے دماغ میں یہ بات بھی آئی کہ وہ خود کس کی پابند ہے... کس کی ؟ شرت کی ؟ شادی اور اشلوک کی ؟ زندگی کرنے کی خواہش ۔ اپنے ڈھنگ کی زندگی کرنے کی خواہشات کی ؟ ہر لمحہ ، جو بیت جاتا ہے ، وہ آدمی کے بس میں نہیں ، وہ اختیار سے باہر کی چیز ہے ۔ پھر یہ بے قراری کیوں ؟ یہ پابندیاں کیوں ؟ کل شرت ہی نہ رہے یا وہ خود ہی شرت کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جائے ۔ ساری پابندیوں ، بندھنوں کو توڑ کر...

لیکن کیا اس کے بعد بھی یہ بندھن ٹوٹ جاتے ہیں ؟ وہ مر جائے جب بھی شرت کی ، شرت اس دنیا میں نہ رہے جب بھی اس کی ۔ زندگی کی یہ گانٹھ کتنی سخت ہے : کبھی نہ کھلنے والی ، کبھی نہ ٹوٹنے والی ، خواہ وہ تڑپ تڑپ ، پاؤں پٹک پٹک کر جان دے دے یہ بندھن نہیں ٹوٹنے والے !

چلو اچھا ہے ، ایک آرام ہے ۔ شرت بہت اچھا شوہر ہے ۔ اس کے بازوؤں میں قوت ہے ، آنکھوں میں محبت کا سمندر موجیں مارتا ہے ۔ زندگی میں اور کیا چاہیے ! زخموں کو بھر جانے دو ۔ انہیں جتنا کریدو گے ٹیسیں اتنی ہی بڑھیں گی ۔ ان کو بھر جانے دو !

باہر دور دور تک پھیلا سمندر تھا ــ وسیع ، گمبھیر زندگی کی طرح اتھاہ ۔ اس کی خاموش سطح پر بارش لگاتار زخم ڈال رہی تھی ۔ ساری فضا میں حبس تھا ، گھٹن تھی ۔ بمبئی کی برسات بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے ، بڑی پریشان کن ہوتی ہے ؛ ایسی ہوتی ہے جہاں کوئی ہنی مون نہیں منا سکتا !

کلا باہر ایک ٹک سمندر کو تکے جا رہی تھی ۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک سمندر اور بھی ہے جس کی سطح پر کلا کی زندگی خاموش لاش کی طرح پڑی ہچکولے کھا رہی ہے ۔ نیلا ، گہرا سمندر ، جوار سے محروم ۔ کوئی بھاری ، تیکھی لہر بھی نہیں اٹھتی جو اس خوبصورت کپڑوں میں لپٹی ہوئی لاش کو نظروں سے دور بھگا لے جائے ۔

پھر ذرا دیر بعد جب شرت نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو آپ سے آپ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ۔ ایک پل گزرتے ہی وہ چونک کر ہٹ گئی اور اس نے شرت کی طرف چونک کر اجنبی نظروں سے دیکھا ۔

" کیوں ، کیا ہوا ؟ "

" کچھ نہیں ۔" اپنی بوکھلاہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا پڑی ۔

" کچھ نہیں کیا ؟ " شرت نے تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے کہا ، " کلا تم جب سے بمبئی آئی ہو لگتا ہے جیسے کچھ ڈھونڈتی پھر رہی ہو ۔ کہو تو کیا کھو گیا ہے تمہارا ؟ "

" شرت ! " تقریباً وہ چیختے ہوئے بولی ، پھر اس کی اپنی آواز اس کے دل میں نشتر کی طرح ٹوٹ گئی ۔ اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے شرت کو دیکھا اور صوفے کے ہتھے پر سر رکھ کر آہستہ آہستہ رونے لگی ۔

باہر سمندر کے سینے پر بارش لگاتار سر دھن رہی تھی ۔

سنڈریلا

انور سجاد

کبھی وہ سوچتی: اس کی عمر ایک لمحہ ہے، کبھی وہ سوچتی: اس کی عمر سو سال ہے، کبھی وہ سوچتی: وہ عمر کی قید میں نہیں، یا شاید ابھی اسے جنم لینا ہے۔

وہ اس کمرے میں سدا سے قید تھی اور اس امید میں تھی کہ کوئی آئے اور اسے اس بطن سے جنوائے۔ پھر وہ سوچتی: کوئی کب اسے جنوائے گا، اسے خود ہی کوئی حیلہ کرنا ہو گا، اس بطن سے مر کے نکلے تو کیا نکلے! وہ چپکے سے دروازہ کھول کر باہر دیکھتی۔ باہر دروازے کے سامنے وہ بھاری بھرکم خونی کتا زبان نکالے ہانپتا ہؤا وحشی مکار نظروں سے دیکھتا جو ازل سے وہاں کھڑا تھا۔ وہ کتے کو پچکارنے کی کوشش کرتی، کتا خونخواری سے بھونکتا، قدم اٹھاتا، وہ پچھلے پیر پلٹ کر جھٹ سے دروازہ بند کر دیتی۔ کتے کے بھونکنے سے ماں کو پتا چل جاتا کہ اس نے پھر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بمع اپنی بیٹیوں کے آتی، کتے کو تھپکی دیتی اور کمرے میں داخل ہو کر بغیر کچھ کہے سنے اس کی خوب پٹائی کرتی۔ جاتے ہوئے اس کی بہنیں کئی گز الجھی ہوئی اون اس کے سامنے ڈال دیتیں اور ماں غراتی کہ جب تک اون کی گنجلکیں نہیں کھلتیں اسے کھانا نہیں ملے گا۔ اس کی آنکھوں کے تمام آنسو خشک ہو جاتے۔ وہ اون سلجھانے لگتی اور کھڑکی سے باہر کھلے آسمان کی طرف دیکھنے لگتی۔

اس کی ماں سوتیلی تھی اور بہنیں بھی سوتیلی۔

اس کی ماں اس کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی اور اس کا باپ اس کی پیدائش سے ایک سال بعد۔ اس نے اپنے سگے ماں باپ کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کا تصور بہت محدود تھا۔ اس کی کائنات یہی کمرہ تھی جس میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ بچپن

میں جو عورت اس کی طرف مسکرا کے دیکھتی تھی ، اس کی ماں تھی ؛ جو شخص اس کے سر پر ھاتھ رکھتا تھا ، اس کا باپ تھا ۔ پھر یہ سب مسکراھٹیں اور پُر شفقت ھاتھ سمٹ سمٹا کر سوتیلی ماں ، بہنوں اور خونخوار کتے کے وجود میں غائب ہو گئے تھے ۔

اس نے دو ایک مرتبہ کمرے کی کھڑکی سے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی ، پر جانے اس بیری کتے کو کیسے خبر ہو جاتی کہ جونہی وہ کھڑکی کی دھلیز پر پیر رکھتی وہ کتا باھر ، کھڑکی کے نیچے ، زبان نکالے وارننگ کی نظروں سے دیکھتا کھڑا ھانپ رھا ہوتا ۔ وہ بے بس ہو کر پھر کمرے میں آتر آتی اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگتی ۔ کبھی کبھی کھڑکی سے ایک کنکر آ کے پیروں میں گرتا ۔ وہ اپنے میلے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتی ، سینے میں اٹھتے طوفان کا گلا گھونٹتی ، وہ کنکر اٹھاتی ، کونے میں پڑے اسی قسم کے بہت سے کنکروں میں رکھ دیتی اور سوچتی :

نہیں ، میں کھڑکی میں نہیں جاؤں گی ۔

نہ چاھنے کے باوجود وہ دیوار کی اوٹ میں ہو کر کھڑکی سے ، سڑک کے پار ، سبز درخت کے نیچے کھڑے اس دیوانے کو دیکھتی جو سرخ چادر اوڑھے ، ٹکٹکی لگائے اس کھڑکی کی طرف دیکھتا مسکراتا رھتا تھا ۔

یہ سرخ چادر والا دیوانہ بھی عجیب شخص تھا : گنجا سر ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں ، چھدری داڑھی ، ناٹا قد ۔ سبز درخت کے نیچے گولڈ مہر کا بہت بڑا پھول لگتا تھا ۔ اس علاقے کے لمبے تڑنگے لڑکے زلفیں بکھرائے ، کمر سے گرتی پتلونیں پہنے ، کوکا کولا پیتے ہوئے اسے چھیڑتے ، آوازے کستے ، پتھر مارتے لیکن یہ دیوانہ بس مسکراتا رھتا تھا ۔ لڑکے خود ھی ھار کر چلے جاتے ۔ لیکن کبھی وہ بہت تنگ آ جاتا تو زخمی شیر اس زور سے نعرہ لگاتا کہ زمین و آسمان دھل جاتے اور شرارتی لڑکے اپنی کوکا کولا وھیں چھوڑ کر بھاگ جاتے ۔ پھر وہ دیوانہ فلک شگاف آواز میں گیت گاتا ، وھاں کے ننگ دھڑنگ پھولے پیٹ والے بچوں کو جمع کرتا اور کمر سے بندھے تھیلے سے ریوڑیاں اور مٹھائیاں نکال کے بانٹنے لگتا ۔

وہ اپنے ہونٹوں کی پپڑیوں پر خشک زبان پھیرتی سوچنے لگتی :
یہ خود پتھروں کا شکار ہے ، میری مدد کیسے کر سکتا ہے !

یہ دیوانہ بھی سدا سے وہیں تھا اور اس کی زندگی کی حقیقتوں کا ایک حصہ تھا ۔ اسے اس کے علاوہ اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ دیوانہ ہے ، لڑکوں سے پتھر کھا کے بچوں میں ریوڑیاں تقسیم کرتا ہے ، اس کی آواز بے حد سریلی ہے ، دھاڑ سو شیروں جتنی ــ اور جب اس کے چاروں طرف تاریکیاں چھا جاتی ہیں تو ایک ٹمٹماتا ہؤا کنکر اس کے پیروں میں آن گرتا ہے ۔ وہ اپنے سینے میں اٹھتے طوفان کا گلا گھونٹ دیتی ہے : نہیں نہیں ، میں کھڑکی میں نہیں جاؤں گی ، وہ مجھے اپنے پاس بلائے گا ۔ میں کھڑکی سے نیچے پیر رکھوں گی تو خونخوار کتا میری تکا بوٹی کر دے گا ۔ لیکن یہ خود کھڑکی پھلانگ کے یہاں کیوں نہیں آ جاتا ؟ اسے کیا پتا میں کس حال میں ہوں ۔ نہیں ، اسے مجھ میں اتنی دلچسپی نہیں یا وہ یہ چاہتا ہے کہ میں خؤد ہمت کروں ۔ لیکن اگر کسی طریقے سے میں اس تک پہنچ بھی جاؤں تو کیا فرق پڑے گا ؟ دیوانہ ہے ، فقیر ہے ، مجھے میری ماں بہنوں ایسے کپڑے کہاں سے لا کر دے گا ؟ مجھے ریوڑیاں اچھی نہیں لگتیں ۔ مگر یہ ہے کون اور سدا ٹکٹکی لگائے کھڑکی کی طرف کیوں دیکھتا رہتا ہے ۔ وہ چاہتی بھی تو کچھ نہیں جان سکتی تھی ، وہ چاہتی بھی تو اسے کچھ بتا نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کی ماں سوتیلی تھی ، بہنیں سوتیلی تھیں اور وہاں سے نکلنے کے ہر راستے پر خوف ناک کتے کا پہرہ تھا ۔ اس کتے سے اس کی جان جاتی تھی ۔ جب بھی وہ چوری چھپے کچھ کھانے لگتی تو وہ کہیں سے آن موجود ہوتا ؛ جب وہ اپنی بہنوں کے کپڑے چرا کر پہننے کی خواہش کرتی تو اس کتے کا تنفس اس کی ہر خواہش پر چھا جاتا ، ہر قسم کی قید سے فرار کے ہر راستے پر وہ زبان نکالے ہانپتا ہؤا وحشی ، مکار نظروں سے دیکھتا کھڑا ہوتا ۔

اس کی ماں اور بہنیں ہر وقت زرق برق پوشاک پہنے رہتی تھیں ۔ اکثر ان کے گھر مہمان آئے رہتے تھے ۔ ہر رات وہ خود کہیں نہ کہیں دعوت پر چلی جاتیں ۔ اسے کسی سے نہ ملنے دیا جاتا ۔ مہمانوں

کے آنے سے پہلے اسے سارے گھر کو شیشے کی طرح چمکانا پڑتا ۔ اس کی ماں اور بہنیں بننے سنورنے میں مصروف ہوتیں ۔ جب گھر میں مہمانوں کے قہقہے گونجنے لگتے تو وہ باورچی خانے میں بند ہو کر برتن دھونے لگتی ۔ رات کو جب وہ چلی جاتیں تو یہ تھکی ٹوٹی اپنے کمرے میں آ جاتی ، تنہا بیٹھ کر اُلجھی اُون کو سلجھانے لگتی اور نہ چاہنے کے باوجود کبھی کبھی کنکر کا انتظار کرنے لگتی ۔

ازل سے اس کی یہی زندگی تھی ۔

پھر ایک رات اس کی ماں اور بہنیں حسبِ معمول کسی دعوت پر گئی تھیں اور وہ اپنے کمرے میں بیٹھی دل بہلانے کے لیے ان کنکروں کو گن رہی تھی تو اس کا نیم روشن کمرہ یکایک جگمگا اُٹھا ۔ اس نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا : بہت تیز روشنی تھی ۔ باہر کار کے انجن کی آواز آ رہی تھی ۔ نہیں ، وہ نہیں ہو سکتا ۔ وہ گھٹنوں بجتے لڑکھڑاتے دل کو سنبھالتی کھڑکی کے پاس گئی ۔ اوٹ سے دیکھا : ایک شاندار لمبی سیاہ کار کھڑی تھی ۔ ایک خوبرو نوجوان سیاہ سوٹ پہنے اُترا اور بو ٹائی کو درست کرتا اس کی کھڑکی کے قریب آ گیا ۔

” تم ہو ؟ “ اس نے سرگوشی میں کہا ۔

” تم آ گئے ، تم آ گئے ۔ مجھے ازل سے تمھارا انتظار تھا ۔ “ اس نے دیوار کے ساتھ سر لگا کے آنکھیں موند لیں ۔ پھر یک دم گھبرا کے ادھر اُدھر دیکھا : کتا کہیں نہیں تھا ۔

” تم ہو ؟ “

” ہاں ۔ “ لفظ اس کی زبان سے پھسل گیا ۔

” گڈ ۔ “ وہ کھڑکی پھلانگ کے اندر آ گیا ۔

” نہیں نہیں ، تم چلے جاؤ یہاں سے ۔ میری ماں سوتیلی ہے ۔ “

” گھبراؤ نہیں ۔ کوئی بات نہیں ۔ وہ یہاں نہیں آئے گی ۔ لو یہ پہن کر دکھاؤ ۔ “ نوجوان نے اپنی جیب سے بڑا خوبصورت جوتا نکالا جس میں ہیرے جڑے تھے ۔ ” پہنو ۔ “

نوجوان کی آواز میں تحکم تھا ۔ وہ مفلوج سی ہو گئی ۔ اس نے آواز کے سحر کے زیرِ اثر جوتا پہن لیا ۔

" بالکل فٹ ہے ، تمھارا ہی ہے ۔"

" میرا ؟ "

" ہاں تمھارا ۔ تم رات شہزادے کی دعوت سے بھاگتے وقت چھوڑ آئی تھیں ۔"

" میں ؟ "

" ہاں ۔ تمھیں یاد نہیں ایک پری تمھیں ہمارے شہزادے کے محل میں لے گئی تھی اور تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ـــ "

" لیکن وہ تو خواب تھا ۔"

" وہ خواب تھا یا نہیں تھا ، مجھے تاویلیں پیش کرنے کا حکم نہیں ۔ چلو ، شہزادہ تمھارے انتظار میں بے قرار ہے ـــ چلو ۔"

اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا ۔ آخر ہزار سال بعد وہ دن آ ہی گیا کہ اس کی نجات ہو گئی اور وہ بھی اتنے شاندار طریقے سے شہزادے کے ہاتھوں ۔ اس کی ماں اور بہنوں کو پتا چلا تو وہ حسد کی آگ میں جل جل کر مر جائیں گی ۔ پھر بھی اس نے انجانے خوف سے کہا : " لیکن ـــ "

" لیکن ویکن کچھ نہیں ۔ شہزادہ تمھیں اس قید سے نجات دلا کر رہے گا ۔ پھر تم ساری عمر اس شاندار محل میں رہو گی جہاں ـــ "

اس نوجوان نے اس کے سامنے جنت تخلیق کی ۔ " اب چلو ۔"

اس نے اپنے میلے کچیلے کپڑوں پر نظر ڈالی ۔ نوجوان بھانپ گیا ۔ " اس کی فکر نہ کرو ۔ کار میں شہزادے کا بھیجا ہؤا لباس رکھا ہے ۔"

" مگر وہ کتا ـــ " اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا ۔

نوجوان نے ہنس کر کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور اپنے پیروں کی طرف اشارہ کیا ۔ خونخوار کتا معصوم بکری بنا ڈاگ فوڈ کی ضیافت اڑانے میں مصروف تھا ۔

" آؤ ۔" نوجوان نے حکم دیا ۔

وہ جنت کی خواہش میں کھڑکی سے اتر آئی ۔ نوجوان نے اس کے لیے لیموسین کا دروازہ کھولا ۔ وہ کار میں قدم رکھنے ہی والی تھی کہ اس کے کانوں میں آواز آئی :

" نہ جانا ۔"

اس نے چونک کر دیکھا ، پاس ہی سبز درخت کی اوٹ میں سرخ چادر والا دیوانہ کھڑا تھا ۔ اس نے گھبرا کر دیوانے کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا ۔ دیوانہ مسکرایا : " یہ کچھ نہیں سن سکتا ، اسے کچھ خبر نہیں ۔"

اس نے نوجوان کو دیکھا : نوجوان دروازہ کھولے ساکت کھڑا تھا ۔ اس کی آنکھیں جامد تھیں ۔

اس نے پھر فٹ بورڈ کی طرف قدم بڑھایا ۔

" نہ جانا ۔" دیوانے نے پھر کہا ۔

" میں شہزادے کی جنت میں جا رہی ہوں ۔"

" پھر واپس نہ آ پاؤ گی ۔"

" تمھیں اس سے کیا ؟ وہ بہت خوبصورت ہے ، شہزادہ ہے ۔"

" تو پھر میری ایک بات مانو : جب وقت ٹھہر جاتا ہے اور مرتا ہؤا لمحے دوسرے لمحے میں جنم لیتا ہے ، اس لمحے سے پہلے پہلے لوٹ آنا ۔"

وہ ہنسی ۔

" میں تمھارا انتظار کروں گا ۔"

وہ اور زور سے ہنسی اور کار میں آ کر بیٹھ گئی ۔ " دیوانہ ۔"

" کون دیوانہ ؟ " نوجوان نے پوچھا ۔

" تم نہیں جانتے ۔" اس نے کار کے پچھلے شیشے سے دیکھا ۔ اس کے کمرے سے آتی مدھم روشنی میں دیوانہ سبز درخت میں گولڈ مہر کا پھول تھا ۔

محل میں لوگوں کا ھجوم تھا ۔ ہر رنگ ، ہر نسل کے لوگ تھے ۔ گورے چٹے نیلی آنکھوں والے شہزادے نے بڑے فخر سے اس کا استقبال کیا ، مہمانوں سے تعارف کرایا ۔ اس کے پیر زمین پر نہیں تھے ، وہ جنت میں تھی ۔ رفتہ رفتہ اس کے کانوں سے آواز غائب ہو گئی تھی ۔ اس لمحے سے پہلے پہلے لوٹ آنا جب مرتا ہؤا لمحہ دوسرے لمحے میں جنم لیتا ہے ۔ وہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتی تھی ۔ شہزادے نے تنگ آ کر اس کی گھڑی اتار کے پھینک

دی ۔ ساتھ ہی وہ آواز مر گئی ۔

"شکریہ ۔" اس نے کہا اور کھلکھلا کے ہنس پڑی ۔

اس نے سونے کے برتنوں میں کھانا کھایا اور ہیرے جڑے گلاسوں میں پانی پیا ۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ پیٹ بھر کے کھانا کھایا ۔ اسے کھانے کا نشہ اتنا چڑھا کہ ناچ کے لیے شہزادے کی درخواست پر وہ بمشکل اٹھی ۔

ہر راؤنڈ میں شہزادہ اسے سینے کے ساتھ چمٹا لیتا اور وہ بادلوں میں اڑنے لگتی ۔ باقی سب شہزادیاں دل ہی دل میں کڑھتی تھیں اور اسے کوستی تھیں ۔

ایک راؤنڈ میں شہزادہ اسے سینے سے چمٹائے ، موسیقی کی لہروں پر بہتا اسے اپنی خواب گاہ میں لے آیا اور وہ دونوں نڈھال ہو کے پروں کے بستر پر گر پڑے ۔ شہزادے نے ہاتھ لہرا کر سونے سے بھری طشتریوں کی طرف اشارہ کیا :

"یہ سب تمھاری ہیں ۔"

"ہوں ۔" اس نے نیم خوابیدہ آنکھوں سے دیکھا ۔

"اب تمھیں کسی چیز کی ضرورت نہیں رہے گی ۔"

"ہوں ۔"

"اب تم میری ہو ۔"

جانے شہزادے کو کیا ہؤا اس نے اس کا گریبان پکڑ کے جھٹکا دیا ۔ اس نے چونک کر دیکھا : شہزادے کے چمکیلے دانت ایک ایک کر کے گرنے لگے ۔ وہ گھبرا کے اٹھی ۔ شہزادے کا بھیجا ہؤا لباس روئی کا تھا ۔ شہزادہ دیوانہ وار روئی نوچ رہا تھا ۔ وہ اس کے بازوؤں میں کسمسائی ۔ عین اسی وقت خواب گاہ کا کلاک چیخا : وقت رک گیا ہے — رک گیا ہے — لوٹ آؤ — لوٹ آؤ — بھاگو — بھاگو — دوسرے لمحے کے پہلے سانس سے پہلے لوٹ آؤ ۔

اس نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے شہزادے کو دیکھا : شہزادے کی مصنوعی بالوں کی وگ سر سے اتر گئی تھی ، اس کی نیلی آنکھیں کرچی کرچی ہو گئی تھیں ، اس کے دانت جھڑ چکے تھے — صرف کینائنز (Canines) تھے جن پر خون کی سرخی تھی ۔

وہ اس کے پنجوں سے تڑپ کر نکلی ۔

’’ یہاں سے کیسے جاؤگی ۔‘‘ شہزادہ ہنستے ہنستے بستر پر دہرا ہو گیا ۔ کلاک اور بھی زور سے چیخا ۔ وہ اپنے ستر کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر دروازے کی طرف بھاگی ۔ دروازہ خود بخود کھل گیا ۔ وہاں اس کی سوتیلی ماں اور بہنیں ہیرے کی جوتیاں پہنے، اس کی طرف بازو پھیلائے کھڑی ہنس رہی تھیں ۔ وہ دوسرے دروازے کی طرف بھاگی ۔

دوسرا ، تیسرا ، چوتھا — ہر دروازے پر اس کی سوتیلی ماں اور بہنیں بازو بڑھائے اسے پکڑنے کے لیے کھڑی ہیں ۔ وہ پاگلوں کی طرح اس جنت میں چکر لگا رہی ہے ۔ شہزادے کے قہقہے کلاک کی چیخوں میں الجھے اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور وہ ہاتھوں سے اپنا ستر چھپائے بھاگ رہی ہے ، بھاگ رہی ہے ۔

چاند اور گہن

عفرا بخاری

کالی کلوٹی سندری اس کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔

وہ اٹھتے بیٹھتے اس کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ کسی کام میں مصروف ہوتی تب بھی سندری کا خیال پیچھا نہ چھوڑتا۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے اچانک سندری ہیروئن کے سنگھاسن پر آ کر بیٹھ جاتی اور وہ انتہائی غصے اور حیرت سے رسالہ کھٹ سے بند کر کے پرے پھینک دیتی۔ ایک دن تو حد ہو گئی۔ وہ برآمدے میں بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ سندری دبے قدموں آئی اور آنگن میں جھپا جھپ جھاڑو لگانے لگی۔ اس نے غیر ارادی طور پر نظریں اٹھا کر دیکھا: مانگے تانگے کے چست لباس میں اس کا بھرا بھرا سڈول جسم ھلکورے لے رہا تھا۔ ھاتھ اور جھاڑو کی ہر ہر جنبش کے ساتھ اس کی کمر لچکتی اور جسم خم کھا کر رقص کا حسین زاویہ بنا دیتا۔ وہ منہ ھی منہ میں کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ اتنا نیچ کام کر کے بھی وہ کتنی خوش اور آسودہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم کی چنچلتا کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ سندری کا جسم پیچ و خم سے بھرا ھؤا تھا۔ اچانک اس کے دل میں سندری کی جگہ لے لینے کی خواھش پیدا ھوئی۔ اپنے ھی دل کی اس ذلیل خواھش کے خلاف اس کے ذھن نے زبردست احتجاج کیا تو وہ سندری پر برس پڑی:

"کام میں خاک دھیان نہیں ھے۔ تم تو اپنے آپ کو ھی لچکانے پھڑکانے میں لگی ھو۔ گانے بجانے کا ایسا شوق ھے تو کسی منڈوے میں نوکری کر لو جا کر۔"

سندری پھٹکار سن کر ایک دم چپ ھو گئی۔ اس کے خاموش لبوں پر اب ایک دلکش مسکراھٹ ابھر آئی تھی۔ یہ مسکراھٹ صرف اسے ھی دلکش لگ رھی تھی، ورنہ سندری تو اب بھی وھی تھی جس کے جسم یا جس کی مسکراھٹ میں اسے کبھی کوئی جاذبیت

نظر نہ آئی تھی -

پہلی بار بد صورت سندری کو دیکھ کر اس نے تمسخر سے کہا تھا :

" ارے واہ سندری! تم تو سچ مچ سندری ہو پر گہنائے چاند جیسی -" سندری نے اس کے مذاق کی کاٹ کو محسوس کیا اور جھاڑو زور شور سے چلا کر صحن میں دھول اڑا دی تھی - وہ کمرے کے اندر جا چکی تھی - کچھ دیر بعد سندری منہ بسورے دروازے میں آئی تو چمکتے سیاہ رنگ اور چیچک زدہ چہرے کو دیکھ کر اسے بڑی گھن آئی تھی - اس نے فوراً گھبرا کر کہا تھا :

" بس بس سندری ، اندر کا کام منگو ہی کرے گی -" جھاڑو کے تنکے سے پیلے دانتوں کو کریدتی سندری زن سے دروازے سے پلٹ گئی تھی -

صبح دودھ مکھن ، جام جلی ، انڈے توس اور پھل پر مشتمل ناشتہ کرنے کے بعد اس پر خمار سا طاری ہو جاتا - صبح سویرے ناشتے کی میز پر ہی اسے جمائیاں آنے لگتیں - ہاتھ پاؤں بے جان ہو جاتے اور سارا جسم ٹوٹنے لگتا - اس کی یہ سستی پلنگ پر چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد ہی دور ہوتی - پلنگ پر لیٹ کر وہ یا تو کوئی گھٹیا ناول پڑھتی یا پھر خواتین کے لیے مخصوص رسائل میں سے گھٹیا اور سستے قسم کے جذباتی افسانے پڑھتی - افسانوں سے جی بھر جاتا تو نئے پکوانوں کی ترکیبیں ، کیل مہاسے دور کرنے ، ہونٹ باریک اور قد لمبا کرنے کے نسخے بھی تفریحاً پڑھ جاتی - اس دوران میں منگو اور سندری آ کر اپنا کام کر جاتیں - کبھی کبھار جب وہ کتاب یا رسالہ بند کر چکی ہوتی تو وہ ٹاکی پھیرتی منگو کے ساتھ بھی دوچار باتیں کر لیتی - اکثر معمولات کا یہی انداز رہتا - اور وہ ایک دن اچانک اروی کے چوڑے سبز پتے پر سے کالی کالی ، میلی میلی ، بھدی انگلیوں کو بھری بھری سیاہ جامنیں اٹھاتے نہ دیکھ لیتی تو سندری کبھی بھی اس کی سوچوں میں دخل انداز ہونے کی جرأت نہ کر پاتی - مگر ہونی ہو کر رہتی ہے -

اس دن بڑی گرمی اور حبس تھا ۔ پنکھا بھی گویا آگ برسا رہا تھا ۔ بے چینی سے ادھر اُدھر کروٹیں بدلتے ہوئے اچانک وہ اُٹھی اور برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ ایک طرف سرکا دیا ۔ بس اسی لمحے اس نے ان آنگلیوں کو دیکھا جو جامن اُٹھا رہی تھیں ۔ اس کی حیرت زدہ نظریں ہولے ہولے اوپر کو اُٹھتی گئیں : انگلیاں ، سینہ ، ٹھڈی ، ہلتے ہونٹ ، ناک اور پھر پورا چہرہ ۔ یہ سندری اور للوا تھے ۔ دونوں برآمدے کی محراب تلے اس کی طرف قدرے پشت کیے بیٹھے اطمینان سے جامنیں کھا رہے تھے ۔ دونوں اتنا قریب بیٹھے تھے کہ جب کبھی بھولا بھٹکا ہوا کا کوئی جھونکا آتا تو سندری کی کھلی لٹیں اُڑ کر للوے کی سیاہ پیشانی سے چھو جاتیں ۔ اچانک للوے نے ہاتھ بڑھا کر ایک موٹی سی جامن سندری کے کھلے منہ میں ڈال دی ۔ سندری نے شرارت سے مسکرا کر ہولے سے للوے کی کالی اور میلی آنگلی پر کاٹ لیا ۔ پھر دونوں اپنے گرد و پیش سے بے نیاز کھیں کھیں ہنسنے لگے ۔

" حد ہے بدمعاشی کی ۔" اس نے ایک جھٹکے سے پردہ ٹھیک کر دیا ۔ " میاں بیوی سہی مگر کچھ تو حیا ہونی چاہیے دیدوں میں ۔" تعجب اور غصے سے اس کے اعصاب کھنچ گئے تھے اور پیشانی کی رگیں اُبھر آئی تھیں ۔ اس کی شادی کو دس سال ہو چلے تھے مگر آج تک کبھی تنہائی میں بھی ایسی بے تکلفی نہ ہوئی ۔ وہ پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور منگو کا انتظار کرنے لگی ۔ وہ سخت غصے میں تھی کیونکہ تصور میں وہ ابھی تک ان آنگلیوں کو مصروف دیکھ رہی تھی ۔ منگو آئی تو اس نے غصے سے کانپتی آواز میں ڈانٹ کر کہا : " منگو یہ کیا بیہودگی ہے ! للوا تیرے پیچھے یہاں کیا لینے آتا ہے ؟ کیا تجھے معلوم نہیں یہ پردے والا گھر ہے ، یہاں پرندہ بھی بغیر اجازت کے پر نہیں مارتا ۔"

" غلطی ہو گئی بی بی ۔" منگو نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیے ۔ پھر بڑی خوشامد سے بولی : " نئی عورت کا چاؤ ہے نا ۔ بارہ بجے ڈیوٹی پر جاتا ہے تب تک پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ مہینے بھر سے ماؤ کے گھر جانے کو کہہ رہی ہے ۔ ماؤ نے بھی دو تین پتر لکھے

ھیں پر جانے نہیں دیتا ۔ میں سمجھا دوں گی اسے ۔'' '' کب سمجھاؤ گی اسے ۔'' اس نے پاؤں پٹخا ، '' ابھی جا کر اس کے کان کھینچو اور بولو اگر پھر ادھر نظر آیا تو جوتے لگوا دوں گی ۔'' منگو دوڑی دوڑی گئی ۔ ذرا سی دیر میں واپس بھی آ گئی مگر اس کے اعصاب ڈھیلے نہیں پڑے ، نہ اس کی بے چینی دور ہوئی ۔ بار بار اس کے تصور میں وہ انگلیاں گھوم جاتیں اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ انگلیاں جامن نہیں کھا رہی تھیں خود اس کے خلاف کوئی گہری سازش کر رہی تھیں ۔

سندری بہت باتیں کرتی تھی ۔ جب آتی پھسکڑا مار کر ماں جی کے سامنے بیٹھ جاتی ۔ ماں جی کو بھی باتیں کرنے اور سننے کا شوق تھا ۔ وہ سندری کی ہر بات پر ہنکارہ بھرتیں اور سندری بے سروپا باتیں کیے جاتی ۔ اس نے کبھی سندری کی باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا ۔ اونچا بولنے پر چونکہ وہ ڈانٹ دیتی تھی اس لیے سندری بڑی احتیاط سے آواز دبا کر بات کرتی ۔

اگلے دن سندری نے اپنی کھسر پھسر شروع کی تو اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ بے دھیانی میں اس کی باتیں سننے لگی ۔ سندری ہولے ہولے بول رہی تھی مگر خاموشی کی وجہ سے اسے ہر بات صاف طور پر سنائی دے رہی تھی ۔ سندری بڑے چاؤ سے للوے کی باتیں کر رہی تھی :

'' ھائے ماں جی بڑا شوکین مجاج ھے ۔ چاھتا ھے ہر وقت سیر سپاٹے ھی کرتے رھیں ۔ کبھی منڈوے لے جاتا ھے کبھی جناح باغ ۔ کل سرکس دکھانے لے گیا ۔ پورے دو روپے کا ٹکٹ خریدا ۔ میں نے کہا بھی : آٹھ آنے والا لے لے ، آگے زمین پر بیٹھ جائیں گے ، پر نہیں مانا ۔ ھائے ماں جی سبھوں کے درمیان مجھے کرسی پر بیٹھے کیسی گھبراہٹ ہوتی رہی پر وہ تو جرا بھی نہیں گھبرایا ، مجے سے بیٹھا سگرٹ پیتا رھا ۔'' ماں جی نے شاید کچھ پوچھا ، سندری ھنسی ۔ (چاندی کے گھنگھرو بجے !)'' ھاں ماں جی یہ چنری وھی لایا تھا ۔ کیسا کھلتا کیسری رنگ ھے ! ھے نا خب صورت ؟ (ھوگی موٹی جھوٹی ململ کی چنری !) مجھے کہتا ھے کام چھوڑ دے ۔ (اور تجھے وہ مہارانیوں کی طرح

تخت پر ھی تو بٹھلا دے گا !) کھیں کھیں ۔ ہے نا پگلا بی بی ۔''

وہ ان باتوں کو بڑی بڑی غور سے سنتی رھی ۔ بھلا وہ کیوں سنتی تھی ان باتوں کو ؟ ان نکمی باتوں میں کون سی نئی یا انوکھی بات تھی ! یا اس کے پاس کس چیز کی کمی تھی جو وہ دوسروں کے گھر ٹٹول رھی تھی ؟ بے چاری غلیظ بدصورت بھنگن کیسی چھوٹی باتوں سے خوش ہو اٹھتی تھی ، چچ چچ ۔ اور اس کے یہاں آسودگی اور خوشحالی کے یہاں سے وھاں تک انبار لگ رہے تھے ۔ سو بار اوڑھے بھی بچھائے بھی تب بھی کمی نہ آئے ۔ وہ کتنی خوبصورت تھی ! آئینے کے سامنے کھڑے ھو کر جب وہ اپنے گلابی گال ، موٹی موٹی بادامی آنکھیں ، گلاب کی پنکھڑیوں ایسے ھونٹ دیکھتی تو بڑا خوش ھوتی ۔

رانیوں مہارانیوں کی طرح اس کی ھر ضرورت گھر بیٹھے پوری ھو جاتی تھی ۔ ھر مہینے ایک بزاز اس کے لیے ریشم کے لس لس کرتے تھان اٹھائے آ جاتا اور وہ جونسا اور جتنا کپڑا چاھتی لے لیتی ۔ بزاز کے بعد ایک درزی فیتہ اور قینچی لیے آ پہنچتا ۔ اپنے سسر کے توسط سے وہ درزی کو سلائی کے بارے میں ھدایات دے دیتی ۔

اس کے کئی صندوق اور الماریاں نت نئے کپڑوں سے ٹھنس گئے تھے ۔

اس کا شوھر ایک کاروباری آدمی تھا ۔ اس کے وقت کا گویا بال بال کاروباری معاملات میں پھنسا ھؤا تھا ۔ وہ بہت کم وقت کے لیے گھر پر رھتا ۔ عموماً اسے ھفتوں گھر سے غائب رھنا پڑتا ۔ وہ اپنے خاوند کی مجبوری کو سمجھتی تھی اس لیے اس پر کڑھنے کی بجائے وہ اپنے شوھر پر فخر کرتی تھی ۔ اس کا شوھر ایک بڑا آدمی تھا اور بڑے آدمیوں کی طرح جگہ جگہ گھومتا پھرتا تھا : کبھی ڈھاکے میں ھوتا تو کبھی مری میں ، کبھی پشاور ھوتا تو کبھی کراچی ۔ اس کی غیر موجودگی میں (اور وہ گھر موجود ھی کب ھوتا تھا !) اس کی ضروریات کا خیال اس کی ساس اور اس کا سسر رکھتے ۔ وہ ھر وقت اس کی دلجمعی کے لیے تیار رھتے ۔ کہیں آنا جانا ھوتا تو ساس سسر کے ساتھ بند موٹر میں بیٹھ کر چلی جاتی ۔ سال میں وہ ایک بار ضرور مائیکے جاتی اور ایک دو ماہ وھاں گزارتی ۔ اس کی ساس اسے

چھوڑ آتی ، پھر اس کی ساس ہی اسے لے آتی ۔ (وہ ایک مصروف آدمی کی بیوی تھی!) کبھی کسی تقریب میں جانا ہوتا تو وہ بڑی خوش ہوتی کیونکہ ان موقعوں پر اپنے حسن ، اپنے قیمتی کپڑوں اور بھاری زیورات کی خوب نمائش کی جا سکتی ہے ۔

اس کے تین خوبصورت بچے تھے اور تینوں دادا دادی سے مانوس تھے۔ دن میں کبھی گھڑی دو گھڑی کو اس کے پاس آ جاتے تو ان کے شور شرابے سے وہ بہت جلد گھبرا جاتی ۔ اصل میں اسے آرام طلبی کی عادت پڑ گئی تھی اور اسی کاہلی کی وجہ سے اس کی توند ذرا سی باہر کو نکل آئی تھی اور جسم پر چربی کی تہیں چڑھنی شروع ہو گئی تھیں مگر اسے اپنی خوبصورتی کے ماند پڑ جانے کا کوئی فکر یا تردد نہ تھا ۔

شام کو اس کے تینوں بچے دادا کے ساتھ پارک میں کھیلنے کے لیے چلے جاتے ۔ سبز سبز نرم گھاس پر وہ لوٹتے، کبھی بھاگتے دوڑتے دور نکل جاتے ۔ ان کا دادا اپنی بڑی سی سفید داڑھی کھجاتا بڑی خشونت بھری نظروں سے چست لباس میں ملبوس فیشن ایبل خواتین کو تاکتا رہتا : سوکھی ، مریل ، زرد ، سیاہ ، جلے پھیکے چہروں والی عورتیں ۔ زندگی کی اصل شادابی سے ان کے چہرے کس طرح خالی ہوتے ! ان چست لباس میں عریاں ہوتی عورتوں کو دیکھ کر وہ دل میں شکر کرتا کہ اس کی بہو بہت شریف ، صحت مند اور خوبصورت ہے ۔

اس کا لباس نہ کبھی ڈھیلا ہؤا نہ تنگ۔ ایک فیشن آتا دوسرا چلا جاتا مگر دونوں کے بیچ کی کڑی کی مانند وہ اپنی جگہ سلامت رہتا ۔

وہ ہر لحاظ سے ایک مطمئن ، خوشحال اور آسودہ زندگی بسر کر رہی تھی ۔ اس کے اور سندری کے درمیان آسمان اور زمین کا فرق حائل تھا ۔ پھر بھی سندری ایک مجسم سوچ بن کر اس کے سست اور آرام پسند ذہن میں داخل ہو گئی تھی اور وہ اس سے چھٹکارا حاصل کر لینے میں ناکام رہی تھی ۔

یہ معمول بن گیا تھا : سندری کام کے دوران موقع ملتے ہی غائب ہو جاتی ۔ جب سے برآمدہ ممنوعہ علاقہ قرار پایا تھا اس نے گیٹ سے

باہر للوے سے ملنا شروع کر دیا تھا ۔ جانے سر جوڑ کر کیا باتیں کیا کرتے ۔ وہ غصے سے کھولا کرتی ۔ کیا یہ اتنا ذرا سا وقت بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں گزار سکتے! وہ باہر نکلتی اور اپنا غصہ نکالنے کو سندری کے کام کا جائزہ لینے لگتی حالانکہ ان تمام چھوٹے چھوٹے کاموں کی ذمہ داری ساس پر تھی ۔ پر سندری کا معاملہ دوسری نوعیت اختیار کر گیا تھا ۔ سندری اس سے بہت ڈرتی تھی اس لیے کام خوب سنوار کر کرتی مگر پھر بھی اسے روزانہ بے حساب گالیاں ملتیں ۔ آخر وہ کیا چاہتی تھی ، کیا سوچتی تھی ؟ اب پلنگ پر بے کار پڑے رہنے کی بجائے وہ کھوئی کھوئی سی سارے گھر میں گھومتی ۔ وہ ان بڑے بڑے کمروں میں کس کو تلاش کیا کرتی تھی ؟ اپنے عیش و آرام کے سامان کو دیکھتی اور خود اپنے آپ سے الجھ جاتی ۔ آخر یہ سب کس کے لیے تھا ، کیوں تھا ؟ کتنی بے کار تھیں یہ چیزیں ! ایک دن اس نے اپنے تمام بکس اور الماریاں کھلوائیں اور صحن میں کپڑوں کا انبار لگا دیا ۔ یہ انبار اتنا زیادہ تھا کہ اس سے چار لڑکیوں کا جہیز تیار ہو سکتا تھا ۔

سندری آئی اور انگلی ہونٹوں میں داب کر رہ گئی ۔ حیران سندری کو دیکھ کر اسے عجیب سی مسرت ہوئی ، جیسے سندری کو حیران دیکھنے کی خاطر ہی اس نے یہ سارا تردد کیا تھا ۔ لیکن یہاں پھر وہ سندری کو اہمیت دے گئی تھی ۔ اسی سوچ نے اس کا گلا گھونٹ دیا ۔ وہ بکھرے کپڑوں کو ساس کے حوالے کر کے اندر پلنگ پر اداس سی جا پڑی ۔

گھر اچانک اسے تنگ اور گھٹا گھٹا سا لگنے لگا تھا ۔ خوامخواہ ہی اس کا ہر کمرے سے دل گھبرایا کرتا ۔ ہر چیز سے ایک عجیب سی فرسودگی ٹپکنے لگی تھی ۔ آخر ایک دن اس نے ساس سے کہا : ” کمروں اور دروازوں کے مستقل ایک سے رنگوں سے جی بھر گیا ہے ، کیوں نہ اس بار ان کے رنگ روغن تبدیل کر دیے جائیں ۔“ ساس تو اسے خوش رکھنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی ، فوراً بولی : ” ابھی تمہارا سسر آتا ہے تو بات کرتی ہوں ۔“ اس جواب سے خوش ہونے کی بجائے جانے کیوں وہ کڑھ کر رہ گئی ۔ آخر اس نے یہ ذکر ساس

سے ہی کیوں کیا ؟

اگلے ہی دن رنگ روغن والے آ پہنچے ۔ مگر اب تک اس کی دلچسپی رنگ روغن سے ختم ہو چکی تھی ۔ اس نے رنگوں کے انتخاب کا معاملہ بھی ساس سسر پر چھوڑ دیا اور خود لاتعلق ہو کر بیٹھ گئی ۔

پھر ایک دن اسے اچانک خیال آیا بچے اس کے لیے بالکل ہی اجنبی بن گئے ہیں ، ان کی تعلیم و تربیت میں وہ کوئی حصہ ہی نہیں لے رہی ۔ اسی دن اس نے بچوں کی ذمہ داری خود اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس نے بچوں کو بلوایا ۔ پہلے پہل تو بچے اس کے پاس خوشی اور شوق سے آئے ۔ آخر وہ ان کی ماں تھی ۔ لیکن بہت جلد وہ اس کے روکھے پھیکے پیار سے کترانے لگے ۔ وہ آوازیں دیتی رہ جاتی اور وہ دادا کی شہ پر اس کے کمرے میں گھسے چور سپاہی کھیلتے رہتے ۔ غصے میں آ کر وہ انہیں گالیاں دیتی اور پیٹتی ۔ دادا دادی مداخلت کرتے تو وہ بگڑتی :

" بس رہنے دیجیے ۔ باپ سر پر نہیں تھا تو آپ نے خوب ہی بچوں کو بگاڑ دیا ہے ۔ ماں کو ماں اور باپ کو باپ نہیں سمجھتے ۔"

ساس سسر دم بخود تھے ۔ یہ بہو کو کیا ہو گیا ہے ! دس سال بعد وہ کیسی باتیں کرنے لگی ہے !

" میں تو جانوں بہو کو کسی دشمن نے تعویذ گھول کر پلوا دیا ہے ۔" ایک دن ساس نے مارے رنج کے کہہ دیا ۔ مگر بہت جلد یہ جنون بھی اس کے سر سے اتر گیا ۔ ساس سسر نے سکھ کا سانس لیا ۔

ایک دن سندری اور منگو نہیں آئیں ــ منگو بیمار ہو گئی تھی ۔ اگلے دن اس نے از خود باز پرس کی :

" کل کیوں نہیں آئی تھیں ۔" سندری اسے دیکھ کر ڈر گئی ۔ دبک کر بولی : " للوا جبردستی میلہ دکھانے لے گیا تھا ۔"

" وہ تجھے زبردستی لے گیا تھا یا تو ہی نخرے دکھا کر اسے لے گئی تھی ! ارے مردوے کے کندھے چڑھے میلہ ٹھیلہ گھومتے شرم نہیں آتی ؟ "

سندری کی بھی رگِ حمیت پھڑکی ، بولی : " بی بی یار تھوڑی

تھا ! اپنے آدمی کے ساتھ گھومنے میں کیا شرم ؟ " اس کا غصہ کچھ اور بھڑکا ، ڈانٹ کر بولی :

" جب تنخواہ کٹے گی تب ہوش آئے گا تجھے - پھر میلے کے نام پر للوا بھی جوتے نہ لگائے تو کہنا - "

سندری گویا سستے چھوٹی ، لاپروائی سے مسکرا کر بولی :

" بی بی یہ بات ہے تو چاہے آپ مہینے کی تنخواہ کاٹ لیں ، للوا کو پروا نہیں ، بڑا جی دار مرد ہے بی بی - " یہ پٹاخہ سا جواب دے کر سندری تو آنگن میں جھاڑو دینے چلی گئی اور وہ کھسیانی سی اپنے ہی ہونٹ کاٹتی کمرے میں آ گئی - خوامخواہ اس کا جی چاہا وہ کسی سے لڑ بیٹھے - کیسی اکتائی اکتائی بے زار سی ہو رہی تھی وہ -

کتنے دنوں وہ اپنے ہی آپ میں بھنائی بھنائی سی رہی - کسی بھی کام میں اس کی طبیعت نہیں لگ رہی تھی - چند بار وہ ساس سے بھی بلاوجہ الجھی مگر تسلی نہیں ہوئی - آخر ایک صبح اس نے معمولی بات پر جھگڑا کھڑا کر دیا اور اس جھگڑے کو اتنا طول دیا کہ شوہر کے جاتے ہی بچوں کو لے کر پہلی بار تن تنہا مائیکے روانہ ہو گئی -

اس دن سندری کام پر آئی تو گھر بی بی بچوں سے خالی بھائیں بھائیں کر رہا تھا - ماں جی ایک طرف منہ سر لپیٹے پڑی تھیں اور میاں جی بھی اپنے کمرے میں گم تھے - جھاڑو بغل میں دبائے وہ بلا تکلف کمروں میں گھستی چلی گئی - چمکتے لشکتے فرشوں اور دیواروں والے کمرے قیمتی اور خوبصورت سامان سے ٹھنسے پڑے تھے - وہ اس انوکھی دنیا کو حیرت بھری نظروں سے تک رہی تھی - اچانک اس کے اندر خوشی کی ایک لہر اٹھی - جانے اتنی بہت سی چیزوں کو دیکھ کر یا کمروں کو بی بی سے خالی دیکھ کر ہنسی فوارے کی مانند اس کے چیچک زدہ چہرے کے داغ داغ سے پھوٹ پڑی - دبی دبی ہنسی کے ساتھ وہ کمرے کمرے میں پھرکی کی طرح گھومنے لگی - کمروں کا سامان کچھ بے ترتیب ہو رہا تھا - ڈریسنگ ٹیبل پر بہت سا سنگھار کا سامان الٹا پڑا تھا - کچھ شیشیاں نیچے گر کر ٹوٹ گئی تھیں ، کچھ ڈبے کھل کر ادھر ادھر بکھرے

پڑے تھے۔ اس نے بڑے اطمینان سے گھٹنوں کے بل جھک کر اوندھے سامان کو سیدھا کیا اور جو نیچے گر پڑا تھا اسے دوبارہ میز پر ٹکا دیا۔ پھر اپنی اوڑھنی آتار دی اور فرش اور میز پر گرے سینٹ، پوڈر اور کریم کو اپنی میلی بدبو دار اوڑھنی میں جذب کرنے لگی۔ اچھی طرح سے سب کچھ صاف کر کے اس نے اوڑھنی کو گچھا مچھا کر کے ناک کی پھنگ پر رکھا اور لمبا سانس کھینچا۔ ملی جلی تیز خوشبو کسی ٹھنڈی خوش‌گوار شے کی طرح اس کی رگوں میں آترتی چلی گئی۔ وہ جلدی جلدی سانس کھینچنے اور چھوڑنے لگی۔ ہر ہر سانس کے ساتھ اسے اپنے اندر ایک نئی زندگی حلول کرتے محسوس ہو رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی خوشبو کی دھونی دے کر اس کے مدتوں کے گندے اور بدبو دار وجود کو پاک صاف بناتا جا رہا ہو۔ خوشی اور جوش میں اس کے پھیپھڑے قلعی والے کی دھونکنی کی طرح پھیل اور سمٹ رہے تھے۔ آخر تھک کر اس نے اوڑھنی کو ناک سے ہٹا دیا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی چوکی پر بکھرے پوڈر پر ہاتھ مارا اور اسے منہ پر مل لیا۔ اس کی کوئلے جیسی سیاہ رنگت میں گلابی رنگ کی آمیزش نہ ہو سکی۔ آئینے میں اپنے پوڈر تھپے بے ڈھنگے چہرے کو دیکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے سیاہ ہونٹوں کو چیر کر اس کے دودھیا سفید دانت نمایاں ہو گئے۔ ہنستے ہنستے اس نے اچانک اپنا منہ بند کر لیا، آلٹے ہاتھ سے منہ کا پوڈر پونچھا اور بےحد سنجیدہ ہو کر چاروں طرف نظر ڈالی۔

'' ہائے اتی چیزیں خریدنے میں باؤ جی نے کتنے پیسے خرچ کیے ہوں گے۔ کیا نہ لا کر دیا۔ بڑا پیار ہوگا بی بی سے! پر بی بی بھی ایک کمینی نکلی۔ جانے کسی اور سے یارانہ ھی گانٹھ لیا ہو۔'' وہ ہر ایک کو اپنی سطح پر لا کر ناپ تول رہی تھی۔ سونے کے کمرے میں پلنگ پر بستر آلٹ پلٹ پڑے تھے۔ اس کی اذیت پسندی کی نس پھر پھڑپھڑائی۔ اس نے بستر کی شکن آلود چادر پر زور سے جھاڑو مارا اور ہنستی ہوئی باھر نکل آئی۔ برآمدے میں اس نے جان بوجھ کر اپنے بھاری بھر کم جھاڑو کو زمین پر دے پٹخا۔ شور پر ماں جی تو کچھ نہیں بولیں البتہ میاں جی اندر سے نکل آئے اور جھڑک

کر بولے: ”کیا شور مچا رہی ہے۔ سہج سے کام کر اور بھاگ جا۔“

”اوہ، بڑا نخرہ چڑھ گیا ہے بڈھے کو۔ اور روز جو بچے قیامت مچاتے تھے اس پہ کبھی کچھ نہیں بولا۔ آج ہلکے سے جھاڑو کی آواز شور بن گئی ہے۔“ وہ لاپروائی سے جھاڑو زور شور سے چلانے لگی۔ ادھر آدھر جہاں کہیں بی بی کی کوئی چیز نظر پڑتی ایک جھاڑو رسید کر دیتی، جیسے کوئی پچھلے بدلے چکا رہی ہو۔ ”کیسے نخرے دکھاتی تھی۔ ذرا پاس سے گزر جاؤ وہیں پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی تھی: ’یہاں نہ بیٹھو، وہاں نہ کھڑی ہو۔‘ صحن میں الگنی پر لٹکتی قمیض دیکھ کر اس نے ایک جھاڑو رسید کیا تو قمیض جھٹکا کھا کر نیچے گر پڑی۔ اس نے جھک کر قمیض اٹھائی۔ کیسی ملائم اور چمک دار تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر اسے پھیلایا تو اسے اپنا سارا وجود خوشبو دار اور ملائم صابن کی جھاگ میں ڈوبتا محسوس ہؤا۔ وہ ہولے ہولے کپڑے کو اپنے گال پر رگڑنے لگی: ”ہائے، بی بی تو نکھٹی ناشکری نکلی۔ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتی تو باؤ جی کے پاؤں دھو دھو پیتی۔“ اچانک اس کا چہرہ کھسیانے پن سے لٹک گیا: ”ہم غلاظت کے کیڑے تو انسان بھی نہیں۔“ وہ دکھی اور آداس ہو گئی تھی اس لیے قمیض الگنی پر ڈالی اور کچن کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ مائی حسبِ معمول روٹیاں پکا رہی تھی، مگر بڑی بے دلی سے۔ سندری نے روٹی مانگی تو مائی نے سالن رکھ کر دو روٹیاں اونچے ہاتھ سے اس کی جھولی میں ڈال دیں۔ پھر تنبیہاً بولی: ”دیکھ یہیں نہ ٹک جانا۔“ ’اپنی نخریلی بی بی کا کچھ تو اثر ہونا تھا کمبخت پر۔‘ سندری دل میں مائی کو کوستی ذرا ہٹ کر یوں بیٹھ گئی کہ دونوں آمنے سامنے ہی رہیں۔ اپنے گرد آلود ہاتھ دوپٹے سے ڈھک کر اس نے نوالہ توڑا، منہ میں ڈالا اور تھوڑا چبا کر بولی: ”کیا بی بی سے کسی کا جھگڑا چل رہا تھا۔“ سندری کا لہجہ غیر دلچسپ اور لاتعلق سا تھا، جیسے کچھ بتا دیا تو ٹھیک، نہ بتایا تو بھی ٹھیک۔ مائی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھی۔ بات کرتی تو کس سے؟ منگو آتی تو دو باتیں ہو جاتیں، مگر کمبختی دیکھو، آج آئی بھی تو سندری: نٹ کھٹ،

گستاخ ، بدتمیز اور چھچھوری ۔ عمر بھی ابھی کیا تھی ۔ ہوگی پندرہ بیس کے درمیان ۔ مائی نے اسے کب منہ لگایا تھا ۔ مگر اب اس نے خود بات چھیڑی تو مائی کے سینے سے بوجھ سا ہٹ گیا ۔ کچھ سندری سے کچھ خود سے مخاطب ہو کر بولی : " جانے میں اتی روٹیاں کس کے لیے پکا رہی ہوں ۔ کھانے والے تو دو بڈھے منہ ہیں ۔ اور اکیلے میں ان کے حلق سے بھی کہاں نوالہ اترے گا ۔ مگر نہ پکاتے بھی جانو وہم آتا تھا ۔ ہائے ، جانے کس کی نظر لگ گئی بھرے پرے گھر کو ۔ کل رات تک تو کوئی بات نہ ہوئی تھی ۔ بس شادی کا ایک پیغام آیا تھا ۔ باؤ جی رات دیر سے آئے ۔ صبح ناشتے کی میز پر بی بی نے صاحب سے ہنس کر کہا :

" ' اس بار تو آپ کے ساتھ شادی میں جائیں گے ۔ ' "

" میاں کام والے آدمی ، جلدی میں تھے ، بولے : ' جیسے پہلے جاتی تھیں ویسے ہی اب بھی جاؤ گی ۔ اب کوئی نئی بات ہوگئی ہے ؟ ' بات کیا سیدھی صاف اور سمجھ آنے والی تھی مگر بی بی کو جانے کیوں غصہ آ گیا ، بولی : ' پہلے جاتی تھی ، اب آپ کے سوا کسی کے ساتھ نہ جاؤں گی ۔ ' میاں بولے : ' مجھ سے تو یہ پاکھنڈ نہ ہو گا ۔ ' تب تک باہر موٹر آ کھڑا ہؤا تھا ۔ میاں چلے گئے ۔ بی بی کمرے میں جا پڑی ۔ ناشتہ چھوڑا ، بچوں کو پیٹا ۔ کسی کے پلے کچھ نہ پڑا تھا ۔ ساس سسر منانے گئے تو بی بی پھٹکار کر بولی : ' اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گی ۔ ' ساس نے کہا : ' دس سال ہوگئے شادی کو ، جب نئی دلہن تھیں تب بھی یہ بات نہ کہی ، اب کیوں کہی؟ میرے بیٹے نے کون سا دکھ دیا اور کون سا سکھ نہ دیا ۔ سچی کتاب پر ہاتھ رکھ کر کہہ دے ۔ ' بی بی بولی : ' میں ان سب چیزوں پر سو بار تھوکتی ہوں ۔ مجھ سے تو منگو کی بدصورت بہو سندری خوش قسمت ہے ۔ ' "

سندری کے ہاتھ سے بے ساختہ نوالہ چھٹ گیا ۔ حیرت سے منہ پھاڑے مائی کی طرف تکتی رہ گئی ۔ یہ مائی نے کیا کہہ دیا تھا ! ہوش تو ٹھکانے ہیں مائی کے ! بچی روٹی کو پلو میں باندھ کو بولی :

" مائی ایک بار پھر کہنا بی بی نے کیا کہا تھا ۔ "

" ارے بس یہی کہا : ' سندری مجھ سے اچھی ہے ۔' اب پوچھو بے چاری سندری بھنگن میں کیا لال جڑے ہیں ؟ "

سندری کا کھلا منہ بند ہوگیا ۔ اس کے دل میں پھلجھڑی سی پھوٹی ۔ ایک دم ہنس کر بولی : " مائی سچ کہنا پھر بی بی نے ایسا کیوں کہا ۔ سچ مچ مجھ میں کون سے موتی ٹکے ہیں ۔"

" میں بھی یہی کہوں ، ساس سسر کو بھی برا لگا ، ان کی تخت پر بیٹھنے والی بہو بھنگن کے بھی برابر نہیں ۔ مگر بی بی تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی ۔ بچوں کا کپڑا لتا لیا اور چلتی بنی ۔ اپنا نہ کوئی زیور لیا نہ کپڑا ، نہ سنگھار پٹار کا سامان ۔ جانو پہلے ایک بکس تو صرف سنگھار کے سامان کا بھر کر ساتھ جاتا تھا ۔ سسر بے چارہ پریشان ہو کر میاں کے پاس دوڑا ۔ میاں کام والے آدمی ، رسان سے بولے : ' چلی گئی ہے تو آپ کیوں فکر کرتے ہیں ؟ خود ہی آ بھی جائے گی ۔' "

سندری دل میں حساب لگانے لگی : ' بھلا میں کس بات میں بی بی سے اچھی ہو گئی ۔ ایک آسمان کا تارا دوسرا نالی کا کیڑا ۔ نہ شکل نہ عقل ۔ نہ کھانے کو نہ اوڑھنے کو ۔ در در کا کوڑا سمیٹو ، گالیاں کھاؤ ، کوئی پاس نہ کھڑا ہونے دے ۔ غلاظت ، گندگی ، بدبو اور ذلت ۔ ہمارا نصیبہ تو بس یہی ہے ۔ پھر بی بی آج تک تو نفرت کرتی رہیں ، ڈانٹتی پھٹکارتی رہیں ۔ جانے کیا بیر ہوگیا تھا مجھ سے بی بی کو ۔ اب مائی کہتی ہے بی بی یوں کہتی تھی ۔ جھوٹ ، صفا جھوٹ ۔'

وہ کسی طور خود کو بہتر ثابت نہ کر سکتی تھی ۔ پھر بھی اس بات نے اہمیت کا ایک دبا دبا سا انوکھا احساس اس کے اندر ضرور جگا دیا تھا ۔ جب وہ بغل میں جھاڑو دبائے باہر نکلی تو وہ ایک دوسری سندری تھی ۔ مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی اور اس پر ایک گھمبیرتا طاری تھی ۔ باہر للوا اس کے انتظار میں کھڑا تھا ۔ اسے دیکھ کر بولا : " آج بڑی دیر لگا دی تو نے ۔" اس نے گھوم کر تیکھی نظروں سے للوا کو دیکھا ۔ للوا کا وجود کوڑے کے ڈرم کی طرح گندگی ، غلاظت اور بدبو کی پوٹ بنا ہوا تھا ۔ اچانک اس کے دل میں للوے کے خلاف غصہ اور نفرت جاگ اٹھی ۔ اس کا

جی چاہا بڑھ کر للوے کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کرے اور کہے: ’ چل بھاگ یہاں سے ۔‘ مگر وہ کچھ نہیں بولی ، چپ چاپ تیز قدموں سے چلتی رہی ۔ للوے نے اسے خاموش دیکھا تو اپنے چوڑے نتھنے پھڑکا کر بولا : ”آج تو بڑی خش بوئیں آ رہی ہیں ۔ جبھی مجاج نہیں مل رہا سرکار کا ۔ معلوم ہوتا ہے آج بی بی کے کمروں میں پھری ہو ۔“ للوا جبڑا پھاڑ کر خوامخواہ ہنس پڑا ۔ وہ پھر بھی چپ رہی تو للوا ذرا خوشامد سے بولا :

”ایک بڑا اچھا پھلم لگا ہے ۔ چلو آج چلتی ہو ۔“

سندری نے اچانک رک کر للوے کی چپڑ جمی چندھی اور گندی آنکھوں میں جھانکا ، پھر جیسے کہیں دور سے بولی :

”للوا ! اگر میں روٹھ کر ماؤ کے گھر چلی جاؤں تو ؟ “ ”تجھے روٹھنے کون دے گا ۔ اگر جبردستی روٹھ جاؤ تو آنکھوں کے بل جاؤں گا اور پلکوں پر بٹھا لاؤں گا ۔ دیکھوں گا کیسے نہ آؤ گی ۔“

سندری چل پڑی ۔ چلتے چلتے اس نے پلو سے روٹی کھول کر للوا کو پکڑا دی : ” یہ لے کھا لے ۔“ پھر اس نے اوڑھنی آتاری ، اسے گچھا مچھا کر کے ناک کی پھنگ پر رکھا ، لمبا سانس کھینچا ۔ ایک بار ، دو بار ۔ خوشبو کی لپٹیں چلی آ رہی تھیں ۔

” ھائے اس خش بو سے تو میرا مغج (مغز) پھٹنے لگا ہے ۔“ سندری نے گچھا مچھا کی ہوئی اوڑھنی کو دور پھینک دیا اور للوا کے کندھے سے انگوچھا آتار کر اپنے سر پر ڈال لیا ۔

دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم

سریندر پرکاش

سمندر پھلانگ کر ہم نے جب میدان عبور کیے تو دیکھا کہ پگڈنڈیاں ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پہاڑوں پر پھیل گئیں ۔ میں اک ذرا رکا اور ان پر نظر ڈالی جو بوجھل سر جھکائے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے ۔ میں بے پناہ اپنائیت کے احساس سے بھر گیا — تب علاحدگی کے بے نام جذبے نے ذہن میں ایک کسک کی صورت اختیار کی اور میں انتہائی غمزدہ ، سر جھکائے وادی میں اتر گیا ۔

جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ سب تھوتھنیاں اٹھائے میری طرف دیکھ رہے تھے ۔ بار بار سر ہلا کر وہ اپنی رفاقت کا اظہار کرتے اور ان کی گردنوں میں بندھی ہوئی دھات کی گھنٹیاں "الوداع ، الوداع" پکار رہی تھیں اور ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے کونوں پر آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے ۔

میرے ہونٹ شدت سے کانپے ، آنکھیں مند گئیں ، پاؤں رک گئے مگر پھر بھی میں بھاری قدموں سے آگے بڑھا ، حتیٰ کہ میں ان کے لیے اور وہ میرے لیے دور افق پر لرزاں نکتے کی صورت اختیار کر گئے ۔

وادی میں اونچے اونچے بے ترتیب درخت جا بجا پھیلے ہوئے تھے جن کے جسموں کی خوشبو فضا میں گھل گئی تھی ۔ نئے راستوں پر چلنے سے دل میں رہ رہ کے امنگ سی پیدا ہوتی ۔ سورج مسکراتا ہوا پہاڑ پر سیڑھی سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ میں گرد آلود پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر صاف شفاف ، چکنی سڑکوں پر آ گیا ۔ پختہ سڑکوں پر صرف میرے پاؤں سے جھڑتی ہوئی گرد اٹھی جو میں پگڈنڈیوں سے لے کر آیا تھا — یا پھر میرے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی ۔

چکنی سڑک کی سیاہی دھیرے دھیرے ابھر کر فضا میں تحلیل ہونے لگی اور افق پر سورج کمزوری سے لڑھکنے لگا ۔

ابھی جھٹپٹا ہی تھا کہ میں ایک گول کشادہ مکان کے بڑے سے پھاٹک پر رکا۔ نئے خوبصورت پھولوں سے لدی جھاڑیوں اور کنجوں میں سے ہوتی ہوئی ایک روش اونچے اونچے ستونوں والے برآمدے تک چلی گئی تھی جس پر بکھرے ہوئے پتھر دن کی آخری زرد دھوپ میں چمچا رہے تھے۔ میں نپے تلے قدم رکھتا ہؤا یوں آگے بڑھا جیسے پہلے بھی یہاں کئی بار آ چکا ہوں۔

خاموش، ویران برآمدے میں میری آواز گونجی۔ مجھے تعجب سا ہؤا۔ یوں محسوس ہؤا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے۔ میں آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ کوئی جواب نہ پا کر آگے بڑھا اور بڑے سے ولندیزی دروازے نے مجھے باہیں پھیلا کر خوش آمدید کہا۔

ولندیزی دروازوں کے ساتھ ہی قدیم آریائی جھروکوں ایسی کھڑکیاں تھیں اور ان سب پر گہرے کتھئی رنگ کے بھاری پردے لٹک رہے تھے جن کی وجہ سے سارے کمرے میں گہرے دھندلکے کا احساس ہو رہا تھا۔ ماحول کی اس ایکا ایکی تبدیلی نے مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دی اور میں سہما سہما سا کھڑا ہو گیا۔

"... نیند کی جھپکی تھی شاید ؟"

نیم تاریک کمرے میں میں سہما سہما سا صوفے کے گدگدے پن میں دھنستا ہؤا پاتال میں اترا جا رہا ہوں۔ آتش دان میں آگ بجھ گئی ہے پھر بھی راکھ میں چھپی بیٹھی چنگاریوں کی چمک گہرے سبز ریشمی قالین پر ابھی موجود ہے۔ کارنر ٹیبل پر رکھے دھات کے گل دان کو میرے بڑے سے ہاتھ نے چھو کر چھوڑ دیا ہے۔ اس کے جسم کی خنکی ابھی تک انگلیوں پر محسوس ہو رہی ہے۔ گل دان کا اپنا ایک الگ وجود میں نے قبول کر لیا ہے۔ ہاتھ میرا ہے اس لیے احساس بھی میرا ہے لیکن گل دان نے میرے احساس کو قبول نہیں کیا۔

مجھے "اس کا" انتظار ہے۔ "وہ" اندر کاریڈار میں کھلنے والے دروازے سے پردہ سرکا کر مسکراتا ہؤا نکلے گا اور میں بوکھلاہٹ میں اٹھ کر اس کی طرف بڑھوں گا اور پھر ہم دونوں بڑی گرم جوشی سے ملیں گے۔ وہ بڑا خوش سلیقہ آدمی ہے۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ، رنگوں کا انتخاب، آرائشی چیزوں کی سج دھج — سب میں ایک

"گریس" ہے ۔ نہ جانے وہ کب سے ان کے بارے میں سوچ رہا تھا ، ان کے لیے بھٹک رہا تھا ۔ اور تب کہیں جا کر وہ سب کر پایا ہے ۔

آتش دان بلیک ماربل کو کاٹ کر بنایا گیا ہے جس پر جا بجا غیر مسلسل سفید دھاریاں ہیں ۔ میں کچھ دیر تک ان دھاریوں کو غور سے دیکھتا رہا ۔ مجھے یوں محسوس ہؤا جیسے دو دھاریاں ایک طویل و عریض صحرا کے "لینڈ اسکیپ" سے مشابہ ہیں ۔ بالکل خالی صحرا ، اُداس ، خاموش ۔ اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہؤا اس صحرا میں کھو گیا اور ریت کے جھکڑ نے مجھے اپنے اندر گم کر لیا ۔ اور میں ویسے ہی سہما سہما خوف زدہ سا اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے لیے اس صحرا کی طرف بڑھا ۔

میں آتش دان پر بنی کارنس پر ہاتھ جما کر ، جھک کر اپنے آپ کو تلاش کرنے لگا ۔ کارنس پر ایک تصویر رکھی تھی جو بے دھیانی میں میرا ہاتھ لگنے سے گر گئی ۔ میں نے اس تصویر کو اُٹھا کر دیکھا : ایک خوش پوش آدمی گود میں ایک ننھی سی بچی کو اُٹھائے بیٹھا ہے اور اس کے بائیں کندھے سے کندھا بھڑائے ایک عورت بیٹھی ہے ۔ دونوں مسکرا رہے ہیں اور بچی ان کی طرف مڑ کر دیکھ رہی ہے ۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ کبھی ایسی ہی تصویر کھنچوانے کے لیے میں بھی بیٹھا تھا اور فوٹوگرافر نے کہا تھا :

"ذرا مسکرائیے !"

ہم تینوں مسکرائے اور فوٹوگرافر نے کہا : "تھینک یو" اور ہم اُٹھ کر بکھر گئے ۔ ہم ابھی تک بکھرے ہوئے ہیں ۔ اگر اکٹھے ہو بھی جائیں تو مسکرا نہیں سکتے ۔ باقی تصویر ویسی کی ویسی کھنچ جائے گی ۔

لیکن "وہ" تصویر میں مسکرا رہا ہے ، اس کی بیوی بھی مسکرا رہی ہے اور بچی بھی شاید ، کیوں کہ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا ۔ ایسے ہی مسکراتا ہؤا وہ پچھلے دروازے سے وارد ہوگا اور اس کی بیوی پچھلے کمروں میں کسی بیڈ روم میں بیٹھی مسکرا رہی ہو گی اور بچی شاید مکان کے پچھواڑے خوبصورت ، پرسکون

کنجوں میں تتلیاں پکڑ رہی ہو گی ۔

صوفے کے سائیڈ ٹیبل پر پینے کے لیے کچھ رکھ دیا گیا ہے ۔ جب میں اس تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اپنے آپ کو صحرا میں کھوج رہا تھا تو کوئی چپکے سے نارنگی کے رنگ کی کسی چیز کا گلاس رکھ گیا تھا ۔

" ٹھک ... ٹھک ... ٹھک ۔" برآمدے سے کسی کے زمین پر لاٹھی ٹیک کر چلنے کی آواز آ رہی ہے : بڑی مسلسل ، بڑی متوازن ، بڑی باقاعدہ ۔ میں دروازے کا پردہ سرکا کر سر باہر نکال کر دیکھتا ہوں ۔ کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہؤا برآمدے کے خم سے مڑ گیا اور اب اس کی پشت بھی غائب ہوگئی ہے اور لاٹھی ٹیکنے کی آواز ہر لحظہ دور ہوتی جا رہی ہے ۔

" سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے ؟ " " ہاں ہاں ، سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے ! " میں واپس کمرے میں آتے ہوئے سوچتا ہوں ۔ نمکین ہواؤں کا جھونکا سب چیزوں کو چھیڑتا ہؤا ، سبُ چیزوں پر سے گزر گیا ۔

" سمندر سے میرا کیا تعلق ہے ؟ میں سمندر کے بارے میں اتنا کیوں فکرمند ہوں ؟ " میرے ذہن میں سمندر اپنی بے کرانی ، اپنی گہرائی اور اپنے مد و جزر کے ساتھ پھیلتا چلا گیا اور میں محسوس کرنے لگا کہ یہ واقعی سمندر کنارے کا کوئی شہر ہے اور میں ایک کمزور سی ، نحیف سی ، چھوٹی سی کشتی کی طرح ہچکولے کھاتا ہؤا ، ڈولتا ہؤا کھڑکی تک پہنچا اور جھٹ سے پردہ ہٹا دیا ۔

" باہر شاید برف گر رہی ہے ؟ " " ایک ایک گالا ، ایک ایک گالا ۔" میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ کھڑکی سے باہر فضا میں دھیرے دھیرے کبھی سیدھا کبھی اُلٹا حرکت کرنے لگا مگر ایک گالا بھی اس پر نہ گرا ، ایک ذرا سی خنکی بھی محسوس نہ ہوئی ۔

" قدیم آریائی جھروکوں ایسی کھڑکی ! " میں ہٹر ہٹر اس کی طرف دیکھنے لگا ۔

" برف کہاں ہے ؟ " " نہیں ، کہیں نہیں ! " میں خود ہی

سوال کرتا ہوں اور پھر خود ہی جواب دیتا ہوں ، مگر اس سوال اور جواب کی آواز کہیں سنائی نہیں دیتی ، صرف محسوس ہوتی ہے : ایک اُداس ، پراسرار سرگوشی ــ اور میں اس احساس سے خوف زدہ ہو کر پھر اس گل دُان کی طرف پلٹتا ہوں جس نے سب سے پہلے اس کمرے میں میرے احساس کو بیدار کیا تھا ۔

بڑا سا گول گل دان جس پر بڑی ترتیب سے نقش و نگار بنائے گئے تھے بالکل بے حرکت پڑا ہے اور اس میں شروع جاڑوں کے پھول سجے ہوئے ہیں ۔ یہ پھول کس ہاتھ نے سجائے ہیں ؟ گل دان سے ہٹ کر میرا ذہن کچھ ہاتھوں کے بارے میں سوچتا ہے جن میں پھول ہیں ۔ پھر ہوا کھڑکی کے پردوں کو چھیڑتی ہے ، دروازے کا پردہ بھی سرسراتا ہے اور میں بالکل تنہا ان تمام چیزوں کے بارے میں سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں اور پھر غم زدہ ہو جاتا ہوں ۔ بے وجہ کا غم ، بے بنیاد اکیلا پن ۔

ایک سانپ میرے ذہن میں پھن پھیلا کر اپنی تیز تڑپتی ہوئی سرخ زبان نکال کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے ، پھر آہستہ سے نیچے قالین پر اُتر جاتا ہے اور تیزی سے چلتا ہؤا پیچھے والے دروازے کی طرف بڑھ جاتا ہے ۔ میں خوف زدگی کی انتہائی کیفیت میں چیخ اُٹھتا ہوں اور میری نظروں کے سامنے بیڈ روم میں بیٹھی ہوئی ، مسکراتی ہوئی ایک عورت انگڑائی لیتی ہے اور تتلیاں پکڑتی ہوئی ایک بچی زقند بھرتی ہے اور میں صوفے کی پشت کو مضبوطی سے تھام لیتا ہوں اور آنکھیں بند کر لیتا ہوں ۔ سارا منظر کہیں دور اندھیرے میں آہستہ آہستہ گم ہو جاتا ہے ۔

" وہ ابھی نہیں آیا ۔ رات باہر لان میں اُتر آئی ہوگی ۔" لاٹھی ٹیکنے کی آواز پھر قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ میں تیزی سے بڑھ کر دروازے کا پردہ ہٹا دیتا ہوں ۔ ایک اندھا ، اُدھیڑ عمر آدمی لاٹھی کے سہارے بڑھ رہا ہے ــ نپے تلے قدموں کے ساتھ لاٹھی کی باقاعدگی سے اُبھرتی ہوئی آواز کے ساتھ ۔ اس سے پیشتر کہ میں اسے بڑھ کر روکوں ، وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور خاموشی سے برآمدے کے خم سے مڑ جاتا ہے ۔ ایکا ایکی پلٹ کر میں کمرے کے خالی پن

کو گھورتا ہوں ۔ بڑا خوبصورت کمرہ ہے ۔ دیوار پر بارہ سنگھے کا ایک سر ٹنگا ہؤا ہے اور اس کے نیچے ایک بڑا ہی مرصع تیر کمان آرائش کے لیے لٹکا ہؤا ہے ۔ کھڑکی اور دروازے کے درمیان والی دیوار کے خالی پن کو بھرنے کے لیے چوڑے سنہری فریم والی ایک بڑی سی تصویر ٹنگی ہے جس میں ہزار رنگوں والی ان گنت جنگلی چڑیاں پھدکتی ہوئی نظر آ رہی ہیں ۔

" سب خوب ہے ! ہر چیز جاذب ہے ! تمام کچھ اپنانے کو جی چاہتا ہے ۔ کاش ! اے کاش ! یہ سب کچھ میرا ہوتا ۔ یہ صوفہ ، کارنر ٹیبل پر پڑا ہؤا گل دان ، بک کیس میں پڑی ہوئی کتابیں ، کارنس پر رکھی ہوئی تصویر ، گہرے سبز قالین کا گدگدا پن ، آریائی جھروکوں ایسی کھڑکیاں ، ولندیزی دروازے پر سرسراتے ہوئے پردے ، بیڈ روم میں مسکراتی عورت ، تتلیاں پکڑتی ہوئی بچی اور ان تمام چیزوں کے اپنا ہونے کا ہمہ گیر ، بھرپور احساس ۔"

" مگر نہیں ـــــ ہیں ۔ یں ۔ ں ! " " اُف ! میری آواز اس قدر بلند کیوں ہے ؟ " مجھے اپنے چلانے پر ندامت محسوس ہوتی ہے ۔ ندامت ، خوف اور اجنبیت کے احساس سے میں گزر جاتا ہوں اور پھر مجھے اپنا وجود گہرے سبز قالین پر اوندھا پڑا محسوس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آدمی قالین کو اپنی انگلیوں میں بھر لینے کی کوشش میں تڑپ رہا ہے ، رو رہا ہے اور پھر اس کی ہچکی بندھ جاتی ہے ۔

" خاموش ہو جاؤ ـــــ خاموش ! " میں گہرے غم میں ڈوب کر اسے کہتا ہوں اور میرے اپنے آنسو ڈھلک کر میرے رخساروں تک آ جاتے ہیں اور میں اسے ویسے ہی خاموشی سے تڑپتا ہؤا دیکھتا ہوں ۔

" ٹھک...ٹھک...ٹھک ۔" میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتا ہوں ۔ " رک جاؤ...و...و...و ! " میں دھاڑتا ہوں ۔ اندھا بالکل میرے قریب سے گزر گیا ہے ۔ اس پر میری آواز کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ میں لپک کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ناکام رہتا ہوں ۔ (یہ میری زندگی کی بہت سی ناکامیوں میں سے

ایک ناکامی ہے ۔ میں اسے پہلے دن سے پکڑنے میں ناکام رہا ہوں ۔)
وہ برآمدے کے موڑ سے اوجھل ہو گیا ہے ۔

اندر وہ قالین پر اوندھا پڑا ابھی تک بسور رہا ہے ۔ پیچھے کھلنے والے دروازے پر ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی ۔ سانپ کے مکان میں گھس جانے سے ذرا بھی ہلچل پیدا نہیں ہوتی ۔ (''اُف کتنے بے حس لوگ ہیں ! '')

اسی دروازے کے قریب تپائی پر کانسے میں ڈھلا ایک بوڑھا بیٹھا بڑی بے فکری سے ناریل پی رہا ہے ۔

'' اچھا تو میں چلتا ہوں ۔''

'' چلتا ہوں ؟ مگر کہاں ؟ '' سوال اور جواب دونوں ہاتھ پھیلائے نظریں ایک دوسرے پر گاڑے کھڑے ہیں اور میں آہستہ سے سرک کر اس مجسمے کے پاس پہنچ جاتا ہوں ۔

'' پانی تو پی لیجیے ۔'' ایک بڑی ہی میٹھی آواز کمرے میں گونجی ۔

'' نہیں ، بس اب میں چلتا ہوں ، بہت دیر ہوگئی ۔'' میں پلٹے بغیر ، اس عورت کو دیکھے بغیر ہی جواب دیتا ہوں ۔

'' لیکن کہاں ؟ '' آواز پھر ابھری اور پھیل گئی ۔ (سوال اور جواب نے مل کر شرارت کی ہے شاید ! اور اب میں ان کے درمیان کھڑا ہوں اور میرے لیے ان کی فتح مند نظروں کی تاب لانا مشکل ہو رہا ہے اور میں سر جھکا کر خاموش ہو جاتا ہوں ۔)

'' یہ سب کچھ اگر نہ ہو سکے تو بھی کوئی بات نہیں ۔ مگر اتنا تو ہو ہی سکتا ہے کہ میں اس بوڑھے کی طرح بے فکری سے بیٹھا تمباکو پیتا رہوں ؟ ''

'' پہلے کانسے میں ڈھلنا پڑے گا ! '' قالین پر اوندھے پڑے آدمی نے کہا اور اٹھ کر آتش دان پر بنے صحرا میں گم ہو گیا ۔

'' کیا کوئی مجھے کانسے میں ڈھالے گا ؟ '' میں نے مجسمے کو مخاطب کر کے کہا ۔ بوڑھے نے تمباکو کا ایک لمبا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے دھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا ۔ قدیم آریائی جھروکوں ایسی کھڑکیوں کے پردے سرسرائے اور بڑی سی تصویر

میں ہزار رنگوں والی جنگلی چڑیوں نے پھدک کر اپنی اپنی جگہیں بدل لیں ۔ میں خوف زدگی کے انتہائی احساس سے لڑکھڑاتا ہؤا سائیڈ ٹیبل تک پہنچا اور غٹاغٹ سارا گلاس چڑھا لیا ۔

'' ابھی اسے صحرا میں کھوجنا ہے ۔ شاید اس شدید برفباری میں بھاگ کر جانا پڑے ۔ یا پھر سمندر کنارے کے شہر میں ۔''

(کشتی بہرحال ساحل تک پہنچنی چاہیے !)

(ایک بپھرا ہؤا سمندر ، ایک ریت اڑاتا صحرا اور ایک برف کا طوفان اور میں اکیلا آدمی ! میں کیا کچھ کر لوں گا ؟) میں دل ہی دل میں اس چیز کو گالی دیتا ہوں جو یہ سب کچھ سوچتی ہے مگر نظر نہیں آتی اور مجھ نحیف ، کمزور ، بے سہارا... کو بھٹکاتی پھرتی ہے ۔

'' ٹھک ... ٹھک ... ٹھک ۔'' وہ پھر گزر گیا ہے ۔ میں اسے پکڑ نہیں سکتا ، اس سے بات نہیں کر سکتا ۔ وہ گونگا ، بہرہ ، اندھا ۔ ذہن میں سوراخ کرتی ہوئی لاٹھی کی آواز ۔

'' چلو بھائی ، چلو ۔'' دروازے پر کسی نے دستک دی ہے ۔

'' مگر وہ تو ابھی آیا نہیں ۔'' میں نے جواب دیا ۔

'' اب نہیں پھر سہی ۔ دیکھو دیر ہو رہی ہے ۔'' آواز باہر لان میں سے گونج کر آ رہی ہے ۔

'' ذرا سنو ! پھر کب آنا ہو گا ؟ '' میں نے پلٹ کر ڈرائنگ روم میں چاروں طرف نظریں گھمائیں جو مجھے انتہائی پسند تھا ـــ پرسکون ، آرام دہ ، '' کوزی '' ۔

جواب میں وہ قہقہہ لگا کر ہنسا ۔ شاید وہ میری حریص نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا تھا ۔

لاٹھی کی آواز بڑی جلدی جلدی دروازے پر سنائی دی ۔ شاید اسے بھی جلدی ہے ۔ باہر صرف آواز تھی ۔ ایک اس کے قہقہے کی آواز ، دوسری اندھے کی لاٹھی کی آواز ۔ اور رات باہر لان میں اتر کر سارے میں پھیل گئی تھی ـــ شروع جاڑوں کی اندھیری رات ۔

''یہ سب تمہارا ہی تو تھا ۔ مگر اب اس سے زیادہ نہیں ۔ بہت دیر ہو رہی ہے ۔'' اس کی آواز پھر گونجی ، پھیلی اور سمٹ کر پھر

باہر واپس چلی گئی ۔

میں کسی ان جانی چیز کے کھو جانے کے غم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔ ”مجھے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا ۔“ میں چیخا ، ”کم از کم میں پچھلے دروازے سے اندر جا کر ان میں ایک لمحے کے لیے بیٹھ تو جاتا ۔ ان کی چاہت ، ان کی اپنائیت کی گرمی سے اپنی آغوش کے خالی پن کو آسودہ تو کر لیتا ۔ یہ ظلم ہے — سراسر ظلم !“

”ہا — ہا — ہا ۔“

میں نے خالی قالین کو اک نظر دیکھا اور پھر بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لینے کے لیے اس پر اوندھا لیٹ گیا اور میرے پشیمانی کے آنسوؤں سے اس کا دامن بھیگنے لگا ۔ اور پھر صحرا میں بھٹکا ہؤا آدمی آہستہ سے چل کو میرے قریب آ کر بیٹھ گیا ۔ کانسے میں ڈھلے ہوئے بوڑھے نے ایک اور گہرا کش لیا اور تمباکو کا دھؤاں میری طرف اگل دیا ۔

میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور پوچھنا چاہا : ”دیکھ رہے ہو ؟ یہ سب دیکھ رہے ہو نا ؟“ ایکا ایکی میں نے اپنی بے چارگی پر قابو پایا اور بازو ہلا کر کہنا چاہا : ”سنو ! تم سب سن لو ۔ سمندر کنارے کے شہر کا پتا ہے نا ؟ اگر کبھی کوئی کمزور ، نحیف ، بے سہارا کشتی ساحل سے آ کر لگے تو سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں !“

اکیلی

کرتار سنگھ دُگل

۱۵- مئی ، تین بجے ، بعد دوپہر -

تین پانچ ، تین پانچ ، تین پانچ -

......

جی !

......

میں مس ہاشمی بول رہی ہوں -

......

جی ہاں ، یاسمین ہاشمی -

......

کون ؟ معاف کیجیے ، میں پہچان نہیں پائی -

......

او ، آپ ؟

......

بھائی جان کو بلاتی ہوں ... سچ ، بھائی جان تو ہیں نہیں -

......

ایئر پورٹ گئے ہیں -

......

جی ، میں کہہ دوں گی ، مسٹر ملک نے ٹیلی فون کیا تھا -

......

جی ، سلیم ملک -

......

۱۵ - پارک روڈ ، مجھے پتا ہے -

......

جی ... جی ؟

......

ابا جان دورے پر ہیں -

......

امی ہسپتال میں ، کتنے ہی دنوں سے ۔

......

جی نہیں ، شاید آپریشن ہو گا ۔

......

اکیلی ؟ نہیں نوکر ہیں ۔

......

جی ، شکریہ ۔

......

جی ، جی ۔

......

جی !

......

آداب ۔

......

جی ۔

......

جی ، بہتر ۔

......

میں کہہ دوں گی ۔

......

آداب...ع...

......

جی ؟

......

جی ہاں ، ٹھیک ہے ۔

......

اچھا ، آداب عر...

......

جی ، جی ضرور ۔

......

آداب عرض ۔

......

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۱۰ منٹ ، بعد دوپہر

تین پانچ ، تین پانچ ، تین پانچ -

......

جی -

......

یاسمین ہاشمی -

......

شکریہ -

......

جی میں اکیلی بالکل نہیں ، سارے نوکر گھر میں ھیں : آیا ماں ھے ، بیرا ھے ، خانساما ھے -

......

ابھی بھائی جان آ جائیں گے -

......

ان کا کوئی پرانا کلاس فیلو ولایت جا رہا ھے -

......

جی ؟

......

ھاں ، کلاس فیلو تو آپ بھی ھیں -

......

مجھے یاد ھے - یاد کیوں نہیں ؟ تب میں بہت چھوٹی تھی -

......

جی ، ابا جان کا کچھ پتا نہیں - ھفتہ دس دن لگ ھی جائیں گے - آج صبح ھی تو گئے ھیں -

......

امی ؟ ھسپتال والوں کی مرضی پر ھے - ابھی تو جانچ ھی ھو رھی ھے -

......

ھاں ، اس بار گرمی نے تو حد کر دی - سات دن سے جھلسا رھی ھے - ایسی گرمی پہلے تو کبھی نہیں پڑی !

......

ھمارا صرف بیڈ روم ایئر کنڈیشنڈ ھے ، گیلری نہیں -

......

ٹیلی فون گیلری میں ہے -

......

جی ؟

......

جی نہیں ، کوئی بات نہیں -

......

آدا...

......

جی شکریہ !

......

جی نہیں -

......

آداب...

......

جی ؟

......

بہت اچھا -

....

آداب عرض -

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۲۰ منٹ ، بعد دوپہر -

تین پانچ ، تین پانچ ، تین پانچ -

......

جی ، میں یاسمین بول رہی ہوں -

......

میری آواز بیٹھی ہوئی ہے ؟ نہیں تو -

....

شاید میں آیا ماں کو پکار رہی تھی -

......

جی ، ہاں - دوپہر کو نوکر تو اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے ہیں ، آیا ماں میرے پاس رہتی ہے - آج وہ بھی غائب ہے - ادھر ادھر کہیں ہو گی - پچھلے مہینے اس کے گھر والا نہیں رہا -

......

جی نہیں ، اکیلی کاہے کو ؟

......

بھائی جان ابھی آ جائیں گے ۔ ان کو پتا ہے پیچھے میں اکیلی ہوں ۔

......

ہاں ، آج گرمی بلا کی ہے ۔ بادل ابھی دور ہیں ۔ مان سون ابھی تو بمبئی بھی نہیں پہنچ ...

......

اچھا ، آداب ۔ بھائی جان آ گئے ہیں شاید ۔

......

نہیں نہیں ، یہ تو کوئی اور موٹر تھی ۔ ہمارے موٹر کے رنگ کی ایمبیسیڈر ۔ ساتھ کی کوٹھی میں چلی گئی ہے ۔ آپ کی موٹر کریم رنگ کی ہے نا ؟ مجھے کریم رنگ بہت پسند ہے ۔

......

سچ !

......

بھائی جان کی طرف دیکھو ، وہاں بیٹھ ہی گئے ہیں ۔

......

کیا ایک گھنٹے بعد آئیں گے ؟ آپ کو کیسے پتا ؟

......

ہوائی جہاز لیٹ ہے ؟ میں مری ، ایک گھنٹہ اور ؟ میں نے کہا بھی تھا : ' ٹیلی فون کرکے پوچھ لو ۔' کہنے لگے : ' ہوائی جہاز ہمیشہ وقت پر آتے ہیں ۔'

......

نہیں ، آیا ماں نہیں ، میری کتاب نیچے گری ہے ۔

......

یوں ہی ایک ناول ہے ، موراویا کا نیا ناول ۔

......

ہاں ، '' ایمپٹی کینوس '' ۔ آپ نے پڑھا ہے ؟ میں نے ابھی شروع کیا ہے ۔ آیا ماں نہیں تھی اور میں نے سوچا اکیلی بیٹھی ... !

......

ڈر ؟ ڈر کس کا ؟ اپنے گھر میں کیا ڈر ؟

......

میری آواز ڈری ہوئی ہے ؟ نہیں تو -

......

آیا ماں نے مجھے دودھ پلایا ہے - امی جان تو تب سے بیمار چلی آ رہی ہیں -

......

یہیں کہیں ہو گی - ابھی آ جائے گی - آج کل بے چاری بڑی اداس ہے - اکیلی ہو گئی ہے نا -

......

نہیں ، آپ کاہے کو تکلیف کریں گے - اور نہیں تو میں لیلیٰ کو ٹیلی فون کر لوں گی - ہم گھنٹوں ٹیلی فون پر باتیں کرتی رہتی ہیں - مجھے ٹیلی فون پر باتیں کرنا اچھا لگتا ہے -

......

آپ کو بھی ؟ سچ ؟

......

آپ کی ایک تصویر ہماری... نہیں ، بھائی جان کے البم میں ہے - سب کے درمیان آپ کھڑے ہیں - سب سے اونچے ، اونچے اور لمبے...

......

پرانی تصویر ہے ! پرانی ہے تو کیا ؟ بھائی جان کے سارے دوست ہیں .... شاید کوئی آ رہا ہے - اچھا آداب ...

......

نہیں ، کوئی نہیں ، بلی ہے - بلی کہیں سے چوہا پکڑ لائی ہے - ٹپ ٹپ خون بہہ رہا ہے - بلی اب برآمدے میں نکل گئی ہے -

......

کیا ؟ آپ کو کوئی بلا رہا ہے ؟

......

اچھا ، آداب -

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۲۵ منٹ ، بعد دوپہر -

ہیلو !

......

لیلیٰ ہے ؟

......

ذرا بلائیے گا ۔

......

میں یاسمین بول رہی ہوں ۔

......

لیلیٰ کیا ہو رہا ہے ؟

......

میں اکیلی تھی ، میں نے سوچا لاؤ تمھیں ٹیلی فون ہی کر لوں ۔

......

باہر دھوپ کتنی ہے ! جیسے کوے کی آنکھ نکل رہی ہو ۔

......

پتا نہیں آج مجھے عجیب عجیب لگ رہا ہے ۔ نامعلوم آیا ماں کہاں چلی گئی ہے ۔ بھائی جان ایئر پورٹ گئے ہیں ۔ ابا دورے پر ہیں اور امی ، تمھیں پتا ہے ہسپتال میں . . .

......

کیا تمھیں کسی ضروری ٹیلی فون کا انتظار ہے ؟

......

کس کا ؟

......

اچھا میں سمجھ گئی ۔

......

تیرا مطلب ہے بابا میں ٹیلی فون بند کر دوں !

......

اچھا ، یہ بتاؤ ، اکبر کے بیٹے کا پہلا نام کیا تھا ؟

......

ہاں ، سلیم ! مجھے یاد نہیں آ رہا تھا ۔

......

اچھا ، بند کرتی ہوں ، بائی ، بائی !

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۴۵ منٹ ، بعد دوپہر ۔

ہیلو! دیکھیے میں پچھلے پندرہ منٹ سے دو ، تین ، چھ ، سات ، نو ، ایک کو ملانے کی کوشش کر رہی ہوں ۔ ٹیلی فون خراب لگتا ہے شاید ۔

......

کیا ؟ خراب نہیں ، ٹیلی فون رکا ہؤا ہے ؟

......

۱۵ منٹ سے کوئی باتیں کیے جا رہا ہے ؟

......

میں مری !

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۴۷ منٹ ، بعد دوپہر ۔

ہیلو ! شمی ہے !

......

نہیں ہے ، سینما گئی ہوئی ہے ؟

......

اس وقت ؟

......

اچھا شکریہ !

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۴۹ منٹ ، بعد دوپہر ۔

ہیلو نجمہ ، میں یاسمین بول رہی ہوں ۔

......

کیسا حال ہے تمھارا ؟

......

کوئی چٹھی آئی اس کی ؟

......

ٹیلی فون کے پاس تیرے ڈیڈی بیٹھے ہیں ؟

......

اچھا میں پھر کر لوں گی ۔

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۵۱ منٹ ، بعد دوپہر ۔

ٹائم پلیز ؟

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۵۲ منٹ ، بعد دوپہر ۔

ٹائم پلیز ؟

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۵۳ منٹ ، بعد دوپہر ۔

ٹائم پلیز ؟

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۴۵ منٹ ، بعد دوپہر -

ٹائم پلیز ؟

۱۵ - مئی ، ۳ بج کر ۵۵ منٹ ، بعد دوپہر -

ٹائم پلیز ؟

۱۵ - مئی ، ۴ بجے شام -

ہیلو !

......

جی صاب !

......

میں آیا ماں بول رہی ہوں صاب -

......

گھر کوئی نہیں صاب -

......

یاسمین بی بی کو سخت بخار ہے صاب ، پلنگ پر بے ہوش پڑی ہیں -

......

میں باہر گئی ہوئی تھی ، واپس آئی تو کمرے میں ریڈیو بہت اونچا لگا ہؤا تھا - اتنا اونچا ریڈیو تو ہماری کوٹھی میں کوئی نہیں بجاتا - انگیٹھی پر رکھی گھڑی نیچے فرش پر ٹکڑے ٹکڑے ہوئی پڑی تھی اور یاسمین بٹیا بخار سے پلنگ پر نڈھال -

......

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے صاب ! میں تو بھلی چنگی اسے چھوڑ کر گئی تھی - کئی بار میں یونہی باہر چلی جاتی ہوں -

......

لڑکی کو شاید کوئی پرچھائیں لگ گئی ہے -

......

آپ آ رہے ہیں ؟

......

آپ کون ھیں صاب ؟ معاف کرنا میں نے پہچانا نہیں ۔

......

پارک روڈ سے چھوٹے صاب کے دوست ۔

......

اچھا صاب ۔

نارسا ضیا جالندھری

ضیا کی شاعری میں مشرقی وجدان اور مغربی عقلیت اس طرح ہم آہنگ ھو گئے ھیں کہ اس کی ھر تخلیق بیک وقت ایک عمیق فکری تجزیہ بھی ھے اور ایک تہ در تہ جمالیاتی تجربہ بھی ۔ ضیا اپنے احساس اور ادراک کی تسکین کے لیے وجود و عدم کے اسرار و ممکنات کی آگہی کا جویا ھے ۔ نجانے یہ جدید فلسفہ' وجودیت ھے یا پرانا مشرقی شیوۂ تسلیم ، ضیا جبرِ مشیت کو اصلِ حقیقت قرار دیتا ھے ۔ اس جبر کی آگہی ھی اس کے نزدیک دل کی آزادی کی کلید ھے ۔ تنہائی ازلی اور ابدی حقیقت ھے ۔ دل اس حقیقت کو تسلیم کر لے تو ھر قربت عزیز تر اور وصال کا ھر لمحہ محبوب تر ھو جاتا ھے ۔

ضیا ایک چابکدست فن کار ھے ۔ لہجے کی مٹھاس اور اسلوب کی موسیقیت اسے فطرت سے ودیعت ھوئے ھیں ۔ لفظوں کی پرکھ اس نے دل و جگر کو گداز کر کے حاصل کی ھے ۔ وہ جو بات کہنا چاھتا ھے ویسا ھی اسلوب اختیار کرتا ھے ۔ چنانچہ اس کی شاعری ابلاغ کی ایک دمکتی ھوئی مثال ھے ۔ اردو اور فارسی شاعری کی کلاسیکی روایت پر کامل دسترس کے ساتھ ساتھ ضیا نے مقامی شاعری کے آھنگ اور آزاد نظم کی تکنیک سے بھی گہرا استفادہ کیا ھے ۔

ضیا کی فکر ، ضیا کی آواز ، ضیا کا لہجہ محض منفرد ھی نہیں اردو شاعری میں ایک نئے طرزِ فکر و اظہار کی ابتدا ھے ۔

قیمت چھ روپے (سرورق اور زیبائش : عبدالرحمان چغتائی) حمید نسیم

سراب

اکوتاگاوا رُیونوسُوکے

موسم ِ خزاں میں ایک روز دوپہر کے وقت میں مسٹر ک ۔ کے ساتھ ، جو مجھ سے ملنے ٹوکیو سے آئے تھے ، سراب دیکھنے گیا ۔ یہ بات ساری دنیا جانتی ہے کہ کوگے نوما کے ساحل پر سراب نظر آیا ہی کرتے ہیں ۔ مثال کے طور پر ہماری ملازمہ ایک کشتی کا الٹا عکس دیکھ کر اتنی متأثر ہوئی کہ سچ مچ کہہ اٹھی : '' یہ بالکل اسی فوٹو جیسا ہے جو کل پرسوں کے اخبار میں چھپا تھا ۔''

ہم نے یہ طے کیا کہ ازومایا ہوٹل کا چکر کاٹ کر جائیں گے اور مسٹر ا کو بھی ساتھ ہو لینے کی دعوت دیتے چلیں گے ۔ وہاں باڑ کی دوسری طرف مسٹر ا ، حسب ِ معمول اپنی سرخ قمیض پہنے ، بڑے انہماک سے نل چلانے میں مصروف تھے ۔ غالباً دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے ۔ میں نے اپنی ایش (Ash) کی بنی ہوئی چھڑی سے انہیں اشارہ کیا ۔

'' اس طرف سے گھوم کر آ جاؤ ۔ اوہ ، آپ بھی ہیں ۔'' انہوں نے ضرور یہ سمجھا کہ مسٹر ک اور میں ملنے آئے ہیں ۔

'' ہم سراب دیکھنے باہر نکلے ہیں ۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں چلتے ؟''

'' کیا کہا تم نے سراب ؟ '' مسٹر ا نے قہقہہ لگایا ۔ '' ان دنوں ، ایسا معلوم ہوتا ہے ، سراب کے سوا کوئی موضوع ِ گفتگو نہیں رہا ۔''

پانچ منٹ بعد ہم مسٹر ا کے ساتھ ریت سے اٹی سڑک پر چلے جا رہے تھے ۔ ہماری بائیں طرف ہموار ریتلا ساحل پھیلا چلا گیا تھا جس پر کسی بیل گاڑی کے پہیوں سے بنی دو کالی کالی بدھیاں دور تک اریبواں کھنچی ہوئی تھیں ۔ اور میں نے ان گہری بدھیوں میں کوئی اجیرن چیز محسوس کی ۔ وہ مجھے عبقریت کے امٹ نقوش معلوم ہوئیں — یہ تھا وہ گہرا تأثر جو انہوں نے مجھ پر چھوڑا ۔

'' مجھے ڈر ہے کہ میری طبیعت ابھی اعتدال پر نہیں آئی ۔ پہیوں

کے نشانوں جیسی چیزیں تک بہ آسانی مجھ پر چھا جاتی ہیں ۔''
مسٹر ا نے میری بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر تیوری چڑھا لی لیکن یہ صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے میری ذہنی کیفیت بھانپ لی ہے ۔

جلد ہی ہمارا گزر صنوبروں سے ہؤا — پست ، مریل سے صنوبر، اور ہم ہی کیچی ندی کے کنارے کنارے چلتے گئے ۔ وسیع و عریض ریتلے ساحل سے پرے سمندر گہرا نیلا اور آجلا آجلا چمک رہا تھا لیکن اینوشیما جزیرہ — اپنے مکانوں اور درختوں سمیت — دور آفق پر دلگیر دھندلکے میں لپٹا ہؤا تھا ۔

'' یہ نیا زمانہ ہے ، ہے نا ؟ '' جب دفعتاً ک نے یہ کہا تو لمحے بھر کو یہ شائبہ ہؤا کہ وہ مسکرایا ہے ۔ نیا زمانہ ؟ لیکن میں نے فوراً ہی ک کے نئے زمانے کا پتا لگا لیا ۔ اس کی مراد ایک جوڑے سے تھی جو سیلانی ریت کو روکنے کی غرض سے لگائی ہوئی بونا بانس کی باڑ کی طرف پیٹھ کیے سمندر کا نظارہ کر رہا تھا ۔ مرد کو ، جس نے ہیٹ اور Inverness برساتی پہن رکھی تھی ، اس '' نئے زمانے '' کا جواز قرار دینا مشکل تھا ، البتہ عورت — جس کے بال کٹے ہوئے تھے ، ہاتھ میں زنانہ چھتری اور پاؤں میں نیچی ایڑی کی جوتیاں تھیں — عین مین نئے زمانے کی تجسیم بنی ہوئی تھی ۔

'' خوش نظر آتے ہیں ۔''

'' میں شرط بدتا ہوں کہ آپ ان سے حسد محسوس کر رہے ہیں ۔'' مسٹر ا نے ک کو چھیڑا ۔

وہ جوڑا اس جگہ سے جہاں سے ہم سراب دیکھنے والے تھے کوئی سو گز دور تھا ۔ ہم تینوں پیٹ کے بل گئے اور ندی کے اس پار ریتلے ساحل سے پرے جو لو کے مارے تاؤ کھا رہا تھا نظر جما دی ۔ ریت پر نیلے ربن کی دھاری سے مشابہ کوئی چیز لہرا رہی تھی ۔ بلاشبہہ سمندر تپتی ہوئی ہوا کو منعکس کر رہا تھا ۔ اس کے سوا ، ساحل پر پڑی ہوئی کشتی کا عکس تو درکنار ، کچھ نظر نہ آ رہا تھا ۔

'' کیا اسے سراب کہتے ہو تم ؟ '' ک نے بظاہر مایوس ہو کر پوچھا ۔ اس کی ٹھوڑی پر اب بھی ریت لگی ہوئی تھی ۔ ٹھیک

اسی وقت ، ساحل پر کوئی دو سو گز دور ، ایک کوا نہ جانے کہاں سے منڈلاتا ہؤا آیا ، لہراتے ہوئے گہرے نیلے ربن کو چھوتا گزرا اور اڑتا اڑتا آگے نکل گیا ۔ جب وہ آگے گیا تو تپتی ہوا کی دھاری پر اس کا معکوس سایہ پڑتا نظر آیا ۔

" بھئی ، مجھے کہنا ہی پڑے گا کہ ہمیں ایک بہترین قسم کا سراب دیکھنے کا موقع ملا ہے ۔"

ک کے اس فقرے کے ساتھ ہی ہم سب ریت سے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اٹھتے ہی ہم نے نئے زمانے کے جوڑے کو اپنی طرف آتے دیکھا ۔ میں نے کچھ گڑبڑا کر پیچھے نظر ڈالی ۔ وہاں اب بھی ، کچھ دیر پہلے کی طرح ، وہ دونوں باڑ کی طرف پیٹھ کیے باتیں کر رہے تھے ۔ ہم سب ، بالخصوص مسٹر ا ، قدرے مایوس ہو کر ہنس پڑے ۔

" یہ بات سراب سے زیادہ مشابہ ہے ، ہے کہ نہیں ؟ "

ہماری طرف آنے والا نیا زمانہ ، ظاہر ہے ، کوئی اور جوڑا تھا ۔ بہرحال ، مرد کے ہیٹ اور عورت کے کٹے ہوئے بالوں کی وجہ سے اس میں اور دوسرے جوڑے میں مطلق تمیز نہ ہو سکتی تھی ۔'

" اس سے تو مجھ پر ذرا گھبراہٹ طاری ہو گئی ہے ۔"

" حیرت ہے کہ یہ چپ چپاتے ہمارے پاس آ کدھر سے ٹپکے ۔"

اسی نوعیت کی باتیں کرتے کرتے ہم اس دفعہ ہی کیجی ندی کے ساتھ ساتھ چلنے کی بجائے ریت کا پست تودہ پار کر گئے ۔ اس تودے کے ارد گرد بھی بانس کی باڑ کے پائیں بونے صنوبروں پر پیلاہٹ چھا رہی تھی ۔ جب ہم ان کے پاس سے گزرے تو مسٹر ا جھکے اور انھوں نے ریت سے کوئی چیز اٹھائی ۔ وہ ایک چوبی تختی تھی جس پر سیاہ رال کا چوکھٹا بنا ہؤا تھا اور کوئی غیرملکی عبارت لکھی تھی ۔

" میں نے کہا ، یہ کیا ؟ س ر ۔ ہ ۔ تسوجی... انوا... اپریلو.. ..جارو... ۱۹۰۶... "

" حیرت ہے ۔ دؤو... ماجیستا...؟ اب یہاں لکھا ہے ۱۹۲۶ ۔"

" میں شرط بدتا ہوں کہ یہ کسی ایسے آدمی کا کتبہ ہے جسے بحری سفر کے دوران میں سپردِ آب کیا گیا تھا ۔" مسٹر ا نے قیاس دوڑایا ۔

" لیکن کیا سمندر پر سپردِ آب کرتے وقت میت کو بالعموم صرف بادبانی کپڑے یا اسی قسم کی چیز میں لپیٹ نہیں دیتے ؟ "

" بالکل درست ۔ اور اس پر وہ یہ تختی لگا دیتے ہیں ۔ دیکھو اس میں میخ ٹھکی ہوئی تھی ۔ اصل میں یہ ضرور کسی صلیب کا حصہ ہو گی ۔"

ہم اب بظاہر بنگلوں کے گرد کھچی بانس کی باڑوں کے ساتھ ساتھ صنوبروں کے ایک جھنڈ سے گزر رہے تھے۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ مسٹر ا کا قیاس چوبی تختی کی بہترین شرح ہے ۔ مجھے دھوپ تک میں بھیانک پن موجود نظر آنے لگا — کوئی ایسی چیز جو ناقابلِ تشریح تھی ۔

" تم نے بھی کیا منحوس شے اٹھا لی ہے واقعی ۔"

" کیا ؟ میں تو اسے بابرکت چیز سمجھ کر اپنے پاس رکھوں گا ۔ لیکن ۱۹۰۶ سے ۱۹۲۶ تک — اس کا مطلب یہ ہؤا کہ وہ کوئی بیس برس کا ہو کر مر گیا ۔ کوئی بیس برس کا —"

" میں حیران ہوں آیا وہ کوئی مرد تھا یا عورت تھی ۔"

" خیر ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ، لیکن تمہیں پتا ہے کہ یہ شخص عین ممکن ہے کوئی یوریشین ہو ۔"

میں نے ، یہ تصور کرتے ہوئے کہ وہ ایک یوریشین نوجوان تھا جس نے سمندر پر وفات پائی تھی ، ک کو جواب دیا ۔ میں نے یہ بھی طے کر لیا کہ اس کی ماں جاپانی تھی ۔

" سراب ؟ " مسٹر ا نے ، بدستور بالکل سامنے دیکھتے ہوئے ، یک‌لخت اپنے آپ سے کہا ۔ ان کی یہ بات سراسر اتمل بے جوڑ تھی جس میں کسی قسم کا اشارہ پنہاں نہ تھا ، لیکن اس نے ذہن میں کسی چیز کو چھؤا ۔

" کیا ہم ایک پیالی کالی چائے پینے کے لیے رکیں ؟ "

ہم ایک بہت گنجان آباد مرکزی سڑک کے نکڑ پر کھڑے تھے۔ گنجان آباد ؟ لیکن خشک ریتلی سڑک تقریباً سونی پڑی تھی ۔

" تمہارا کیا خیال ہے ، ک ؟ "

" جو تمہاری مرضی ۔"

ٹھیک اسی وقت میں نے دیکھا کہ ایک برف کے گالے جیسا کتا دم دبائے ہماری طرف چلا آ رہا ہے ۔

(۲)

ک کے ٹوکیو چلے جانے کے بعد مسٹر ا ، میری بیوی اور میں دوبارہ باہر نکلے اور ہم نے ہی کیجی ندی کا پل پار کیا ۔ شام کے تقریباً سات بجے تھے ۔ ہم ابھی ابھی کھانا کھا کر اٹھے تھے ۔

اس شام ستارے تک نظر نہ آ رہے تھے ۔ کم کم گفتگو کرتے ہوئے ہم سنسان ساحل پر ٹہلتے رہے ۔ اور ساحل پر ہی کیجی ندی کے دہانے کے پاس ایک روشنی ٹمٹما رہی تھی ۔ غالباً وہ ان کشتیوں کے لیے خشکی کی علامت کا کام دے رہی تھی جو مچھلیاں پکڑنے سمندر پر نکلی ہوئی تھیں ۔

لہروں کا شور لگاتار سنائی دے رہا تھا ۔ جب ہم پانی کے کنارے پہنچے تو سمندر کی بو زیادہ کھاری ہو گئی ۔ یہ بو خود سمندر سے نہیں بلکہ یوں کہیے کہ سمندری گھاس پھوس اور سمندر میں بہہ کر آنے والی گلی سڑی دلدلی لکڑیوں سے آ رہی تھی ۔ کسی وجہ سے اس بو نے میرے نتھنوں اور میری کھال کو یکساں طور پر ستایا ۔

ہم کچھ دیر پانی کے پاس کھڑے لہروں کی جھمجھاتی چوٹیاں دیکھتے رہے ۔ چاروں طرف کالا سیاہ سمندر ہی سمندر تھا ۔ مجھے کازوسا ساحل پر اپنا دس برس پہلے کا عارضی قیام اور ایک خاص دوست یاد آیا جو میرے ساتھ ٹھیرا تھا اور جس نے ، اپنا کام کرنے کے علاوہ ، میرے افسانے " رتالو کا دلیا " کے پروف پڑھنے میں میرا ہاتھ بٹایا تھا ۔

اس اثنا میں مسٹر ا پانی کے پاس اکڑوں بیٹھ گئے اور ایک دیا سلائی جلانے لگے ۔

" تم کیا کرنا چاہ رہے ہو ؟ "

" کوئی خاص بات نہیں ۔ صرف ایک دیا سلائی جلانے سے کم بخت ڈھیروں ہی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں ۔ "

انھوں نے ، جزوی طور پر میری بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے ، گردن موڑ کر اوپر کو ہماری طرف دیکھا ۔ جیسا کہ انھوں نے کہا

تھا ایک دیا سلائی کی روشنی نے بالکل اسی طرح بکھرے ہوئے گندہمو کوڈیم* اور سراندیپ کی کائی کے درمیان انواع و اقسام کے سیپ آجاگر کر دیے - جونہی وہ دیا سلائی بجھی انہوں نے ایک اور جلا لی اور لگے کنارے کنارے ٹہلنے -

'' کیسی بھیانک چیز ہے! میں تو سمجھا یہ کسی ڈوبے ہوئے مردے کا پاؤں ہے -''

وہ غسل کرتے وقت پہننے کا جوتا ثابت ہؤا جو آدھا ریت میں دبا ہؤا تھا - ایک طرف سمندری گھاس کے گچھوں کے بیچ میں اسفنج کا بہت بڑا ٹکڑا پڑا تھا - جب دوسری دیا سلائی بجھی تو اندھیرا پہلے سے بھی زیادہ گہرا معلوم ہونے لگا -

'' ویسی تحفہ چیز کوئی نہیں ملی جیسی اب سے پہلے دن میں آپ کے ہاتھ لگی تھی -''

'' تحفہ چیز ؟ اوہ تمہارا مطلب ہے وہ چوبی تختی - پتا ہے وہ واقعی غیر معمولی شے ہے -''

ہم نے طے کیا کہ وسیع ساحل کو ، پیچھے لہروں کا شور برابر سنتے ہوئے ، پار کر کے واپس چلا جائے - ہمارے پاؤں بار بار کبھی ریت پر اور کبھی سمندری گھاس پھوس پر پڑتے تھے -

'' یہاں بھی آس پاس شاید ہمیں بہت سی چیزیں مل جائیں ؟ ''

'' ایک اور دیا سلائی جلاؤں کیا ؟ ''

'' ارے چھوڑیے بھی - میں نے کہا ، کیا یہ گھنٹی کی جھنکار نہیں ؟ ''

میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ شاید یہ بھی ان بہت سے واہموں میں سے ایک ہے جن سے میرا حال ہی میں سابقہ پڑ چکا تھا - مجھے ایسا لگا کہ یقیناً کہیں آس پاس کوئی گھنٹی بج رہی ہے - میں اسے دوبارہ پوچھنے ہی والا تھا کہ کیا اسے بھی گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہے تو میری بیوی ، جو ہم سے دو قدم پیچھے تھی ، ہنستی ہوئی بولی :

'' تمہیں میری کھڑاؤں میں لگی ہوئی گھنٹی کی آواز آ رہی ہے ، آ رہی ہے نا ؟ ''

لیکن میں پیچھے مڑے بغیر بتا سکتا تھا کہ اس نے پیال کے

---

* Codium - دریائی گیاہ کی ایک قسم - مترجم -

بنے ہوئے چپل پہن رکھے تھے ۔
" سمجھیے آج شام میں نے کھڑاویں پہن رکھی ہیں جس طرح بچپن میں پہنا کرتی تھی ۔"
" اوہو ۔ گھنٹی تو ان کی آستین میں بج رہی ہے ۔ اب میں سمجھ گیا ۔ یہ ننھی ے کا کھلونا ہے ۔ وہی سیلولائڈ کا کھلونا جس میں بجنے والی گھنٹی لگی ہوئی ہے ۔"
یہ کہہ کر مسٹر ا چپکے چپکے ہنسے ۔ میری بیوی قدم بڑھا کر ہم سے آ ملی اور ہم تینوں شانہ بشانہ چلنے لگے ۔ ہمارا آپس میں بات چیت کرنے کا امکان اس کے ٹھٹھول کی وجہ سے بڑھ گیا تھا ۔
میں نے ا کو اپنا وہ خواب سنایا جو میں نے گزشتہ شب دیکھا تھا ۔ میں جس میں ایک فیشن ایبل کوٹھی کے آگے کھڑا ایک ٹرک ڈرائیور سے گپ لڑاتا رہا تھا ۔ پورے خواب بھر میں سوچتا رہا کہ اس ڈرائیور سے مل چکا ہوں لیکن میری اس کی ملاقات آخر ہوئی کس جگہ تھی یہ مجھے جاگنے کے بعد بھی پتا نہ چل سکا ۔
" پھر یکایک مجھے یاد آیا کہ وہ ایک رپورٹر تھی جو تین یا چار سال پہلے میرا انٹرویو لینے آئی تھی ۔"
" تو پھر وہ ڈرائیور عورت تھی ؟ "
" نہیں ۔ تھا تو وہ مرد ہی ۔ بس چہرہ اس عورت جیسا تھا ۔ کسی چیز کو خواہ ہم صرف ایک ہی بار دیکھیں ، وہ پھر بھی ہمارے دماغ میں کہیں نہ کہیں ایسا نقش چھوڑ جائے گی جو کبھی مٹ نہیں سکتا ۔"
" شاید ایسا ہی ہوتا ہو ۔ چہرہ تک ، اگر وہ خاص طور پر جاذبِ نظر ہو ۔"
" مجھے یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ میں نے اس کے چہرے میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی ۔ اسی لیے یہ بات اور زیادہ ڈراؤنی سی ہوگئی ہے ۔ مجھے لگتا ہے کہ ڈھیروں ہی چیزیں ہمارے بھی شعور کی دہلیز کے اس پار گھات لگائے بیٹھی رہتی ہیں ۔"
" یہ بالکل روشن دیا سلائی جیسا معاملہ ہے ، آدمی کو بہت سی چیزیں دکھائی دے جاتی ہیں ۔ ..."
ان چیزوں کے بارے میں بات چیت کرتے کرتے اتفاقاً میرے

مشاہدے میں آیا کہ صرف ہمارے چہرے صاف طور پر نظر آ رہے ہیں ۔ تاہم پہلے کی طرح اس وقت بھی ستاروں کی روشنی نہ تھی ۔ میں پھر بے چینی محسوس کرنے اور بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگا ۔ میری بیوی نے بھی ضرور یہ محسوس کر لیا ہو گا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے میرے شبہے پر صاد کیا :

" یہ سب ریت کی وجہ سے ہے ۔ کیا تمہارے خیال میں ایسا نہیں ؟ "

اس نے اپنی آستینوں کو ایک ساتھ تھام کر مڑ کر لمبے چوڑے ساحل پر نظر ڈالی ۔

" معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے ۔"

" یہ ریت بدبخت تو سچ مچ عملی مذاق کرنے کا عادی ہے ۔ سراب بھی اسی کی کارستانی ہے ۔ آپ نے ابھی تک کوئی سراب نہیں دیکھا ، مسز —؟ "

" نہیں ، میرا خیال نہیں کہ دیکھا ہو ۔ بس ابھی کل پرسوں میں نے ایک مرتبہ کوئی نیلی سی چیز دیکھی تھی..."

" بس جو کچھ ہے یہی ہے ۔ جو ہم نے آج دیکھا تھا وہ بھی ایسا ہی تھا ۔"

ہم نے ھی کیجی ندی کا پل پار کیا اور پشتے کی صورت میں بنی ہوئی پکی سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ہوٹل جا پہنچے۔ سارے صنوبروں کی پھننگیں ہوا سے جو چپ چپاتے چل پڑی تھی سرسرا رہی تھیں ۔ اسی وقت مجھے ایسا معلوم ہؤا کہ ایک چھوٹے قد کا آدمی تیز تیز قدم اٹھاتا ہماری طرف چلا آ رہا ہے اور مجھے ایک فریب نظر یاد آ گیا جس سے میرا انہی گرمیوں میں ایک شام سابقہ پڑا تھا ۔ وہ شام بھی آج ھی کی شام سے مشابہ تھی ، اور کاغذ کے ایک ٹکڑے نے جو حور کے پیڑ میں اٹکا ہؤا تھا کسی طرح ایک خود کی شکل اختیار کر لی تھی ۔ لیکن یہ آدمی کوئی فریب نظر نہ تھا ۔ جب ہم ایک دوسرے کے قریب آئے تو مجھے اس کی سفید قمیض کا سامنے کا حصہ نظر آنے لگا ۔

" حیرت ہے یہ کیا چیز ہے ۔ میرا مطلب اس شخص کی ٹانی

میں لگی ہوئی پن سے ہے ۔''

میں نے یہ الفاظ بڑبڑائے ہی تھے کہ مجھ پر انکشاف ہؤا کہ جسے میں اس کی ٹائی میں لگی ہوئی پن سمجھ رہا تھا وہ دراصل اس کے سگریٹ کی لو تھی ۔ سب سے پہلے میری بیوی آستین میں منہ چھپا کر دبی دبی آواز میں ہنسی ۔ لیکن وہ آدمی ، ادھر نظر ڈالے بغیر ، تیز تیز چلتا ہمارے پاس سے گزر گیا ۔

'' اچھا تو پھر ، شب بخیر ۔''

'' شب بخیر ۔''

ہم بغیر کسی تمہید کے مسٹر ا سے رخصت ہوئے اور صنوبروں میں سائیں سائیں کرتی ہوا کے شور میں چلتے گئے ؛ کیڑے مکوڑے مدھم آواز میں جھنگار رہے تھے ۔

'' ان کی شادی کی سنہری سال گرہ کب ہوگی ؟ '' میری بیوی کی مراد میرے والد کی شادی کی سال گرہ سے تھی ۔

'' پتا نہیں کب ہو گی ۔ جانی ، کیا ہمارے پاس ٹوکیو سے مکھن آ گیا ہے ؟ ''

'' مکھن نہیں آیا ۔ صرف ساسیج ۔''

آخر ہم اپنے گھر کے پھاٹک پر پہنچ گئے ۔ پھاٹک جو نیم وا تھا ۔

ترجمہ : محمد سلیم الرحمٰن

دلدل

اکوتاگاوا ریونوسوکے

ایک بارانی سہ پہر کا ذکر ہے - جس جگہ تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی وہاں میں نے ایک کمرے میں ایک روغنی تصویر دریافت کی - میرا یہ " دریافت کی " کہنا شاید مبالغہ معلوم ہو لیکن واقعہ دراصل یہی تھا - جس تصویر کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ایک کونے میں ، جہاں روشنی کا انتظام غیر معمولی طور پر ناقص تھا ، کس مپرسی کے عالم میں ٹنگی ہوئی تھی ، اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کا چوکھٹا بڑا پھٹیچر تھا - جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کا عنوان " دلدل " تھا اور اسے کسی ایسے مصور نے بنایا تھا جس کی مطلق کوئی حیثیت نہ تھی - یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ تصویر ، جس میں گدلے پانی اور گنجان ہریالی میں الجھی ہوئی سیلی زمین کے سوا کچھ نہ دکھایا گیا تھا ، ناظرین کے ایک عام مجمعے کو اپنی طرف صرف اچٹتی ہوئی نظر ڈالنے پر بھی مجبور کر سکتی -

تاہم یہ بات خاصی عجیب تھی کہ اس مصور نے ، اس قدر گنجان ہریالی کا منظر دکھانے میں ، سبز رنگ کی رمق تک نہ برتی تھی - نرسل ، انجیر اور حور کے درخت — ہر شے کو کیچڑ جیسے زرد رنگ میں ، سیلے ہوئے پلاستر سے مشابہ زرد رنگ میں جو طبیعت پر گراں گزرتا تھا ، بنایا گیا تھا - کیا مصور کو ہریالی کا رنگ ایسا ہی نظر آتا تھا ؟ یا اس نے ہریالی کی تصویر بناتے وقت کسی وجہ سے غلو کے اس انداز کو ترجیح دی تھی ؟ میں جو اس تصویر کے سامنے کھڑا اس کا نرالا افسوں محسوس کر رہا تھا ، حیران ہونے کے سوا کیا کر سکتا تھا -

لیکن تصویر کو دیکھتے رہنے سے یہ بات بتدریج واضح ہوتی گئی کہ اس میں ایک مہیب طاقت گھات لگائے بیٹھی ہے - پس منظر بالخصوص بڑے جاندار انداز میں کھینچا گیا تھا — سچ تو یہ ہے کہ

وہ اتنا جاندار تھا کہ اس پر پاؤں دھرنے کی کیفیت کو تقریباً محسوس کیا جا سکتا تھا : پھسلواں کیچڑ جس پر قدم رکھتے ہی پاؤں ٹخنے تک اندر دھنس جاتا ہے ۔ اس چھوٹی سی روغنی تصویر میں مجھے ایک ایسے فن کار کی قابلِ رحم بناوٹی ادا نظر آئی جو فطرت کو اپنی گرفت میں لانے پر تلا ہؤا تھا؛ اور اس کی زرد دلدلی ہریالی سے مجھے بہت ارفع وجدان کی کیفیت بہم پہنچی ، جیسی آرٹ کے تمام شاندار کارناموں سے بہم پہنچا کرتی ہے ۔ وہاں ہر وضع قطع کی تصویریں نمائش کے لیے موجود تھیں مگر میں نے اور کسی کو اس قدر زور دار نہ پایا ۔

" یہ کہتے ہی بنے گی کہ آپ بہت متأثر معلوم ہوتے ہیں ۔"

اس فقرے پر حیران ہو کر ، جسے میرے کندھے کو تھپک کر ادا کیا گیا تھا ، میں نے کچھ گڑبڑاتے ہوئے ، جلدی سے مڑ کر دیکھا ۔

" بھئی ، کیا خیال ہے آپ کا اس کے بارے میں ؟ "

سوال کرنے والے نے ، اپنی تازہ تازہ منڈی ہوئی ٹھوڑی سے بے اعتنائی کے ساتھ دلدلی تصویر کی طرف اشارہ کیا ۔ وہ آرٹ کا نامہ نگار تھا اور خود کو ماہرِ فن سمجھتا تھا ۔ ہٹا کٹا آدمی تھا اور فیشن ایبل کتھئی سوٹ ڈاٹے ہوئے تھا ۔ ان ناگوار تأثرات کو یاد کرتے ہوئے ، جو ایک یا دوبار مجھے اس آدمی کی طرف سے ملے تھے ، میں نے خاصی ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا :

" یہ ایک شاہکار ہے ۔"

" شاہکار ہے ! یہ تو دلچسپ بات ہے ۔"

ہنسی کے مارے اس کے پیٹ میں بل پڑے جا رہے تھے ۔ وہ تماشائی ، جو پاس کھڑے تصویریں ملاحظہ کر رہے تھے ، بظاہر اس شور کی وجہ سے متعجب ہو کر جو وہ مچا رہا تھا ، یکایک ہماری طرف دیکھنے لگے ۔ میں اور زیادہ چڑ گیا ۔

" یہ دلچسپ بات ہے ۔ اجازت دیجیے کہ میں یہ جتا دوں کہ یہ تصویر کلب کے کسی باقاعدہ رکن کی بنائی ہوئی نہیں ہے ، لیکن چونکہ یہ شخص اس تصویر کو یہاں پیش کرنے پر اصرار کرتا رہتا تھا اس لیے اس کے پسماندگان نے کسی نہ کسی طرح ججوں کو اس

پر راضی کر لیا کہ تصویر اس کونے میں ٹانگ دی جائے۔"

" پسماندگان نے؟ تو پھر ، یہ مصور مر چکا ہے ؟ "

" ہاں ، مر چکا۔ وہ تو زندہ ہوتے ہوئے بھی فی الواقع مردہ ہی تھا۔"

کچھ دیر سے میرا تجسس میری چڑچڑاہٹ پر غالب آتا جا رہا تھا۔

" وہ کیسے ؟ "

" اس کا دماغ کافی عرصے سے خراب تھا۔"

" تمھارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے یہ تصویر بنائی تھی تب بھی ؟ "

" اور کیا۔ کسی پاگل کے سوا کون ایسے رنگ برتے گا ؟ اس پر بھی آپ اسے شاہکار کہہ رہے ہیں اور عش عش کر رہے ہیں۔ اور یہی وہ بات ہے جس پر مجھے واقعی ہنسی آ رہی ہے۔"

ہنس مکھ نامہ نگار ایک دفعہ پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ شاید اسے یہ توقع تھی کہ میں اپنی کم علمی پر شرمندہ ہو جاؤں گا۔ یا وہ مجھے اپنی برتر فنی سوجھ بوجھ سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال ، کچھ بھی سہی اس کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ جوں جوں اس کی روداد میں نے سنی مجھے یوں لگا کہ میری ساری روح میں مہیب متانت کے احساس سے ملتی جلتی کوئی چیز اہتزاز کی لہر دوڑا رہی ہے۔ ہیبت زدہ ہو کر میں نے دوبارہ اس دلدلی تصویر پر نظر جما دی اور نئے سرے سے اس مختصر کینوس میں ایک ایسے فنکار کی قابلِ رحم شبیہہ کا پتا لگایا جسے ہولناک کرب اور عدم تحفظ کے احساس کا عذاب سہنا پڑا تھا۔

" جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا دماغ چل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی مرضی اور توقع کے مطابق مصوری کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ کم از کم اس بات کی داد شاید ہم اسے دے سکتے ہیں۔"

نامہ نگار کے چمکتے ہوئے چہرے پر تقریباً شادماں مسکراہٹ پھیل گئی۔ صرف یہی وہ صلہ تھا جو ہم میں سے ایک کو اس دنیا

سے ملا اور اسے پانے کے لیے اسے اپنی جان کی بازی لگانی پڑی تھی۔ ایک عجیب کپکپاہٹ کے ساتھ، جو میرے جسم میں ہلچل مچاتی دوڑ رہی تھی، میں نے تیسری بار اس سوگوار تصویر میں جھانکا۔ وہاں تاریک ہوتے آسمان اور پانی کے درمیان نرسل، انجیر اور حور کے درخت کھڑے تھے۔ سب کے سب نمناک ہلکے بادامی زرد رنگ میں، برہنہ فطرت کی جابرانہ طاقت سے دھڑکتے ہوئے....

"ہاں، یہ ایک شاہکار ہے۔"

میں نے، نامہ نگار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، للکارتے ہوئے دہرایا۔

۱۹۱۹ ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

[اکوتاگوا — ۱۸۹۲ تا ۱۹۲۷ — کا شمار جدید جاپان کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ مشہور فلم "راشومون" انھی کے دو افسانوں پر مبنی تھی۔ فن کار کی نفسیات اور فن پارے کی ماہیت، ان کے خاص موضوع تھے — مترجم۔]

شبِ سیاہ میں اُمید کا دیا بھی میں
نشانۂ ستمِ موجۂ صبا بھی میں

*

تغزل کی نئی سرحدوں پر فکر
کے طوفانی مناظر میں جلتا ہوا چراغ :

آبِ رواں

سرورق : حنیف رامے
۵/-

*

گلافتاب

اندھیروں سے اُلجھتے ہوئے کسی سورج
کی طرح جس کے پنکھ اور پنکھڑیاں
غزل کے اُفق پر کسی فصلِ تازہ کی
دلیل ہیں

*

کیا ہوں ظفر اندھیرے اُجالے کی جنگ میں
دن سا مرے وجود میں یہ ڈوبتا ہے کیا

سرورق : حنیف رامے
۶/-